مسیحؑ کی گمشدہ زندگی

مؤلفہ

پیام شاہجہانپوری

"ادارۂ تاریخ و تحقیق"

این ۲۳ عوامی فلیٹس - ریواز گارڈن - لاہور (۵۴۰۰۰)-

کتاب :- مسیحؑ کی گمشدہ زندگی

مصنف :- پیام شاہجہان پوری

ناشر :- حکیم ولی الرحمٰن ناصر
۳/سی عوامی فلیٹس ریواز گارڈن لاہور

پرنٹر :- محمد محسن

مطبع :- لاہور آرٹ پریس ۱۵ نیو انارکلی لاہور

بار اول اپریل ۱۹۹۲ء

تقسیم کار رضی الدین خاں

قیمت پچھتّر روپے ----75

ملنے کا پتہ :- ادارۂ تاریخ و تحقیق

این / ۲۳ عوامی فلیٹس - ریواز گارڈن لاہور (۵۴۰۰۰)

ٹیلی فون نمبر (۳۲۲۳۱۳)

ابتدائیہ

کچھ شکایتیں، کچھ شکریے

اپنی ہر کتاب کی طرح اس کتاب کی تحریر و تالیف کے سلسلے میں بھی مجھے مختلف لائبریریوں سے رجوع کرنا پڑا اور بلاشبہ ان میں سے بیشتر لائبریریوں کا مجھے پورا تعاون حاصل رہا۔ عام طور پر ہم مصنف لوگ لائبریریوں کے سربراہوں کا تو نام بنام شکریہ ادا کرتے ہیں مگر ان غریب کارکنوں کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں جن کی محنت شاقہ اور اپنے فرض سے لگن لائبریریوں کو حقیقی معنوں میں گہوارہ علم بناتی ہے۔ لاہور کی پنجاب پبلک لائبریری سے جو پاکستان کی ایک عظیم لائبریری ہے کم و بیش تیس سال سے میرا تعلق ہے اس دوران میں ان غریب کارکنوں کو جنہیں شاید "HELPER" کہا جاتا ہے میں نے بہت قریب سے دیکھا ان میں سے تین اصحاب نے مجھے بہت متاثر کیا ایک محمد شفیع صاحب جو اب ریٹائر ہو چکے ہیں اور بلاشبہ جو اپنے شعبے میں استاد کا درجہ رکھتے تھے ان کے بعد برکت علی صاحب اور ناصرالدین صاحب جو آج کل لائبریری میں اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں۔ یہ دونوں مددگار کارکن بہت سی کتابوں کے بارے میں نہ صرف یہ جانتے ہیں کہ ان میں سے کون سی کتاب کہاں رکھی ہے اور لائبریری میں موجود بھی ہے یا نہیں؟ بلکہ مصنفوں اور طالبان کتب سے مخلصانہ تعاون کرتے ہیں، پوری محنت بلکہ دل سوزی سے کتاب تلاش کر کے لاتے ہیں حتیٰ کہ کیٹلاگ کے خانوں کو کھنگالتے ہیں کتابوں کے نمبر تلاش کرتے ہیں اور اس طرح مصنفوں اور طالبان کتب کو مطمئن کرتے ہیں حالانکہ یہ اضافی امور ان کے فرائض میں شامل نہیں، اس سے ان کی اپنے کام سے غیر معمولی لگن اور علم سے دلچسپی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، ایسے کارکن علم کا سرمایہ اور اس قابل ہیں کہ انتظامیہ ان کی قدر کرے بلکہ عملاً بھی ان کی حوصلہ افزائی کرے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ محمد شفیع صاحب جیسے باخبر اور صاحب تجربہ کارکن کو توسیعی بنیادوں پر

دوبارہ لائبریری میں لایا جائے اور ان کے تجربے سے فائدہ اٹھایا جائے ــــ موجودہ حالت میں یہ ادارہ بہت کچھ محتاج اصلاح' ہے اس کے باوجود اس لائبریری میں ایسے صاحب تجربہ اور لائبریری سائنس سے پوری آگہی رکھنے والے خوش خلق لوگ موجود ہیں کہ اگر ان کے مشوروں اور صلاحیتوں سے صحیح رنگ میں فائدہ اٹھایا جائے تو پنجاب پبلک لائبریری اپنے انتظام و انصرام کے اعتبار سے دیال سنگھ کالج لائبریری کا تو مقام حاصل کر سکتی ہے جس کے چیف لائبریرین نصرت اشیر صاحب نے صرف ایک سال کی قلیل مدت میں لائبریری کی کایا پلٹ دی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پنجاب پبلک لائبریری دیال سنگھ لائبریری سے کمتر درجے کی لائبریری ہے' بلاشبہ اپنی وسعت اور کتابوں کی کثرت کے اعتبار سے یہ بہت بڑی لائبریری ہے جس کا شمار پاکستان کی چند عظیم لائبریریوں میں ہونا چاہئے ان سطور کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس قدیم و عظیم ادارے کے ارباب حل و عقد کو ان کے فرائض کی طرف متوجہ کیا جاسکے تاکہ وہ اسے عظیم سے عظیم تر بنا سکیں۔ انہیں یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئے کہ لوگ لائبریریوں میں علم کی پیاس لے کر آتے ہیں اگر ان کی تشنگی بجھانے کی بجائے انہیں اور جھلسا دیا جائے تو وہ دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔ لائبریریوں کے عملے کو بہت خوش گفتار اور خندہ رو ہونا چاہئے جو کارکن ان خوبیوں سے عاری ہوں انہیں ملازمت سے تو برطرف نہیں کرنا چاہئے البتہ کسی اور جگہ مثلاً پولیس لائن میں بھیج دینا چاہئے' علمی و ادبی فضا ان کے لئے ہرگز موزوں نہیں یہاں تو حافظ خدا بخش صاحب' چوہدری غلام احمد صاحب اور محترمہ رئیسہ ظفر جیسے لوگوں کی ضرورت ہے جو لائبریرین ہوتے ہوئے اپنی نشستوں سے اٹھ کر کتابوں کی الماریوں کے پاس جاتے ہیں' کیٹلاگ کے خانے تلاش کرتے ہیں اور کتابیں ڈھونڈ کر سامنے رکھ دیتے ہیں کہ "یہ لیجئے اپنی مطلوبہ کتاب" اور پھر پیشانی پر شکن تک نہیں لاتے نہ اس خدمت کا کوئی صلہ چاہتے ہیں ایسے ہی لوگ قابل قدر اور جبین علم کا جھومر ہوتے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے سابق چیف لائبریرین جناب انوار الحق اور فیل سیکشن کے لائبریرین جمیل احمد صاحب رضوی اور حافظ مختار احمد صاحب گوندل کو میں نے ایسے ہی لائبریرین حضرات میں پایا جن پر لائبریریاں فخر کرتی ہیں بلکہ جو لائبریریوں کی عظمت ہوتے ہیں اللہ انہیں خوش رکھے۔

پیام شاہجہان پوری

فہرست

مشرق میں اسرائیلی بستیاں

مسیحؑ کا سفر مشرق

مسیحؑ کا سفر آخرت

مسیحؑ خدا کی پناہ میں

حضرت مریمؑ کی روداد سفر

رفع مسیحؑ کی سائنسی بنیاد

***

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مُقدمہ

خوفناک سازش

گذشتہ سال انہی دنوں میں نے اپنی کتاب "مسیحؑ کا سفر زندگی" مکمل کی تھی اور ٹھیک ایک سال کے بعد آج اپنی زیر نظر کتاب "مسیحؑ کی گم شدہ زندگی" مکمل کر رہا ہوں۔ اس دوسری کتاب کا موضوع اس وقت بھی میرے ذہن میں تھا جب میں اس سلسلے کی پہلی کتاب لکھ رہا تھا' اس وقت بھی بہت سے قیمتی حوالے میری نظر سے گزرے تھے جنہیں میں نے عمداً موضوع گفتگو نہیں بنایا کیونکہ کتاب کی ضخامت اس کی اجازت نہیں دیتی تھی' یوں بھی یہ ایک الگ موضوع تھا۔ "مسیحؑ کا سفر زندگی" کی اشاعت کے بعد بعض اصحاب کے خطوط موصول ہوئے جنہوں نے کتاب کو پسند کیا مگر اعتراض کیا کہ یہ تو ثابت ہو گیا کہ حضرت مسیحؑ ناصری کو صلیب سے زندہ اتار لیا گیا تھا اور علاج معالجے کے بعد وہ صحت یاب ہو گئے تھے مگر یہ نہیں بتایا گیا کہ اس کے بعد جناب مسیحؑ کے ساتھ کیا ماجرا گذرا؟ صحت یاب ہو کر آپؑ کہاں رہے؟ فلسطین میں یا فلسطین سے باہر؟ کہاں کہاں گئے؟ کب اور کہاں فوت ہوئے اور آپؑ کی والدہ ماجدہ حضرت مریمؑ پر کیا گذری؟

بلاشبہ یہ بہت اہم سوالات تھے چنانچہ میں نے اپنی دوسری تمام مصروفیات ترک کر کے اپنے آپ کو ان سوالات کے جواب تلاش کرنے کے لئے وقف کر دیا اور الحمدللہ کہ آج حضرت مسیحؑ کی روداد حیات کا دوسرا حصہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ یہ موضوع صرف مذہب کا نہیں بلکہ تاریخ کا بھی ہے' عام معلومات سے بھی اس کا

تعلق ہے۔ اپنے گردوپیش سے آگاہی حاصل کرنا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اپنے اکابر اور اپنے بزرگوں سے متعلق واقفیت کی پیاس بھی فطرت انسانی میں رکھی گئی ہے۔ حضرت مسیحؑ بھی بلاشبہ ہمارے جلیل القدر اکابر میں سے تھے اس لئے ان کے صحیح حالات زندگی ہمیں معلوم ہونے چاہئیں لیکن افسوس کہ ہمارے ہاں حضرت مسیحؑ کے واقعات زندگی کو بھی متنازعہ بلکہ چیستاں بنا دیا گیا اور صدیوں سے ہمارے بچوں کو پڑھایا جا رہا ہے کہ حضرت مسیحؑ آسمان پر چلے گئے اور دو ہزار سال سے وہیں تشریف فرما ہیں البتہ آخری زمانے میں وہاں سے اتر کر امت محمدیہ میں نزول فرمائیں گے اور اس کی ساری مشکلیں آسان فرما دیں گے۔ کسی نے یہ نہ سوچا کہ ان کی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے قرآن حکیم تو فرماتا ہے کہ:-

ورسولاً الٰی بنی اسرئیل (آل عمران آیت نمبر48)

یعنی وہ صرف بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ خود حضرت مسیحؑ بھی فرماتے ہیں کہ:-

"میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا
اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا" (متی باب نمبر۱۵ آیت نمبر۲۴)

گویا حضرت مسیحؑ نے سرے سے اس تصور ہی کی نفی کر دی کہ آپؑ اپنی قوم کے علاوہ کسی دوسری قوم یا مذہب کی پیروی کرنے والوں کی طرف بھیجے گئے۔ آپؑ نے بہت سختی سے اس کا انکار کیا اور چھ سو سال کے بعد رسول اقدسؐ پر نازل ہونے والے قرآن نے بھی اپنے سے پہلے نازل ہونے والی کتاب (انجیل) کی تصدیق فرما دی کہ مسیحؑ ابن مریم صرف بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے مگر ہمیں قرآن حکیم کے خلاف اور اس سے متضاد عقیدہ گھونٹ گھونٹ کر پلایا جاتا ہے کہ نہیں! حضرت مسیحؑ مسلمانوں کی طرف رسول بنا کر مبعوث کئے جائیں گے۔ اس موضوع پر ہم اپنی کتاب "مسیحؑ کا سفر زندگی" میں قدرے تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں اور ہمیں خوشی ہے کہ اس کتاب نے کچھ لوگوں کو متاثر کیا اور انہوں نے مسیحؑ کی حیات آسمانی کا عقیدہ ترک کر دیا۔ اس کے باوجود اگر کوئی یہ عقیدہ رکھتا ہے تو بڑے شوق سے رکھے اسلام میں جبر جائز نہیں یہ

اس کا حق ہے بلکہ بنیادی حق، آخر دنیا میں ایسے لوگ بھی تو ہیں جو حضرت خضرؑ کو زندہ تسلیم کرتے ہیں ایک پوری قوم (یہودی) حضرت ادریسؑ اور حضرت الیاسؑ کو آسمان پر بجسم عنصری زندہ تسلیم کرتی ہے اس تعداد میں ایک کا اضافہ اور سہی۔

یہودی عقیدہ

دراصل یہ عقیدہ ہمارے ہاں مسیحیوں سے آیا ہے اور مسیحیوں کو پولوس نامی ایک یہودی نے گمراہ کیا۔ گویا آسمان پر اٹھائے جانے کا عقیدہ بنیادی طور پر یہودی عقیدہ ہے کیونکہ جب حضرت مسیحؑ نے اپنی قوم (یہودیوں) کو اپنی نبوت و رسالت کی طرف دعوت دی تو انہوں نے آپؑ کو قبول کرنے میں یہی عذر پیش کیا کہ تم مسیح موعود کس طرح ہو سکتے ہو۔ مسیح موعود سے پہلے تو ایلیاہ (حضرت الیاسؑ) آسمان سے نازل ہوں گے وہ ابھی کہاں نازل ہوئے جو ہم تمہیں مسیح موعود مان لیں اس پر حضرت مسیحؑ نے فرمایا:-

"اور چاہو تو مانو ایلیاہ جو آنے والا تھا یہی (یوحنا) ہے" (متی باب نمبر۱۱ آیت نمبر۱۴)

حضرت مسیحؑ کا مقصد یہ تھا کہ تم غلط سمجھے ہو ایلیاہ سے مراد حضرت الیاسؑ پیغمبر نہیں جو صدیوں قبل فوت ہو چکے ہیں بلکہ ایک ایسا پیغمبر مراد ہے جس میں حضرت الیاس (ایلیاہ) کی خصوصیات و صفات ہوں گی اور دیکھو ان صفات والی شخصیت یوحنا (حضرت یحییٰ) ہیں، اگر چاہو تو مان لو مگر یہودیوں نے نہ مانا کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ ایلیاہ تو آسمان سے اترے گا جبکہ حضرت یحییٰ (یوحنا) کو وہ جانتے تھے کہ یہ شخص تو آسمان سے نازل نہیں ہوا بلکہ یہ تو حضرت زکریاؑ کا بیٹا ہے اور ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے پس انہوں نے حضرت یوحناؑ اور حضرت مسیحؑ دونوں کا قصہ پاک کرنا چاہا مگر وہ حضرت مسیحؑ کو قتل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ یہ دیکھ کر انہوں نے وہ کام کیا جو تلوار سے نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کام یہ تھا کہ حضرت مسیحؑ کی تعلیم کو مسخ کر دیا، مسیحی عقائد کو بگاڑ دیا۔ اس سلسلہ میں بنیادی کام پولوس نے کیا جو مسیحیوں میں پولوس رسول کے نام سے مشہور ہے۔ مغرب کے ممتاز مسیحی مورخ ہولگر کرسٹن (HOLGER KERSTEN) نے پولوس کو خوب سمجھا اور اس کی تحریک پر بہت بصیرت افروز تبصرہ کیا، وہ لکھتا ہے کہ:-

پولوس کی شخصیت؟

"پولوس کا اصل نام ساؤل تھا۔ وہ ایک امیر اور عالی نسب خاندان کا فرد تھا اور

یہودی روایات کی بہت سختی سے پاسداری کرتا تھا۔ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ یونانی زبان پر اسے کامل عبور حاصل تھا۔ اس نے فلسفے کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ بہت اچھا اور باکمال شاعر اور بہت فاضل شخص تھا۔ یونانی زبان میں اس نے جو لٹریچر تخلیق کیا وہ بہت ذوق و شوق سے پڑھا جاتا تھا' یہ اس کی نظمیں اور فلسفے کی کتابیں تھیں۔ اس نے یروشلم آکر عبرانی زبان میں بھی کامل دستگاہ حاصل کی۔ یہی زمانہ تھا جب حضرت مسیحؑ یروشلم اور قرب و جوار میں اپنا پیغام پہنچا رہے تھے اور یہودی یہ نیا دین قبول کر رہے تھے۔ اس نئی تحریک نے پولوس کو نہایت کٹر اور متعصب یہودی بنا دیا وہ حضرت مسیحؑ اور ابتدائی مسیحیوں کا سخت دشمن ہو گیا۔ غالباً اسی زمانے میں اس نے اپنا نام تبدیل کیا اور ساؤل کی بجائے پولوس کے نام سے خود کو متعارف کروایا۔ حضرت مسیحؑ کی دشمنی میں وہ اتنا آگے چلا گیا کہ بیت المقدس کے یہودی پیشوائے اعظم سے مل کر اس نے یروشلم اور اس سے باہر آباد یہودیوں کو گرفتار کرنے کی اجازت حاصل کر لی"۔

" JESUS LIVED IN INDIA " BY MR. HOLGER - KERSTEN , P - 28.

اس نے مسیحیوں پر سخت ترین مظالم کئے اور انہیں بری طرح برباد کیا۔ وہ خود اعتراف کرتا ہے کہ مسیحیت قبول کرنے سے پیشتر وہ مسیحیوں کو ایذائیں دیا کرتا تھا چنانچہ انجیل (رسولوں کے اعمال) باب نمبر۹ کی آیات ۱۳۱ ۱۴ ۱۵ ۲۱ میں پولوس حضرت مسیحؑ اور مسیحیوں کے خون کا پیاسا نظر آتا ہے۔

واقعہ صلیب کے بعد جب حضرت مسیحؑ ہجرت کر کے دمشق چلے گئے اور یہودیوں اور رومی حکومت کو معلوم ہو گیا کہ آپؑ صلیب سے زندہ بچ نکلے ہیں اور دمشق یا اس کے مضافات میں مقیم ہیں تو پولوس نے حضرت مسیحؑ کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا۔ مغرب کا ایک ممتاز مورخ رابرٹ گریوز (ROBERT GRAVES) لکھتا ہے کہ "پولوس نے بیت المقدس کے پیشوائے اعظم کے اشارے پر دمشق کا سفر اختیار کیا۔ وہ اپنے ساتھ مسلح یہودیوں کا ایک دستہ بھی لے گیا تھا۔ اس کے پاس بظاہر تو یہودیوں سے مذہبی ٹیکس وصول کرنے کا پروانہ تھا لیکن درحقیقت اس کا اصل کام اپنے مسلح دستے کی مدد سے حضرت مسیحؑ کو گرفتار کرنا تھا تاکہ آپؑ کو دوبارہ صلیب پر چڑھا دیا جائے مگر دمشق پہنچ کر

جب اس کی نگاہ حضرت مسیحؑ پر پڑی تو وہ آپ کا روحانی جلال اور ظاہری شوکت دیکھ کر سہم گیا اور خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔"

JESUS IN ROME, " BY ROBERT GRAVES AND JOSHUA PORD. P-26,29

حضرت مسیحؑ کے ساتھ بھی مسلح مسیحیوں کا دستہ تھا جو آپؑ کی حفاظت پر مامور تھا۔ دمشق میں آپؑ کو بہت قدر و منزلت حاصل تھی۔ پولوس حضرت مسیحؑ کی ساحرانہ دلکشی سے بہت متاثر ہوا۔ مسیحی مورخ مسٹر ہولگر کرسٹن لکھتے ہیں کہ "پولوس نے دمشق میں حضرت مسیحؑ کو دیکھ کر ان کی شخصیت میں بہت کشش محسوس کی یہی وہ لمحات تھے جب اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس تحریک میں شامل ہو جائے گا اس طرح اسے اپنا مستقبل بہت روشن نظر آیا اور اس نے ایک روحانی پیشوا کے روپ میں اس اسٹیج پر اپنا کردار ادا کرنے کے لئے خود کو تیار کرنا شروع کر دیا جو اس کے خیال میں مستقبل میں اسے حاصل ہو سکتا تھا"۔

"JESUS LIVED IN INDIA" P-28.

پولوس کی تبدیلی مذہب

چنانچہ پولوس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا اقدام کیا اور یہودیت ترک کر کے مسیحیت اختیار کر لی۔

پولوس نے مسیحیت تو اختیار کر لی مگر چونکہ اس کا ماضی مسیحؑ دشمنی کی وجہ سے بہت بھیانک تھا اس لئے کوئی شخص آسانی سے یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوتا تھا کہ اس نے یہودیت ترک کر کے سچے دل سے مسیحیت اختیار کر لی ہے چنانچہ انجیل میں ہے کہ جب پولوس دمشق کے عبادت خانوں میں حضرت مسیحؑ کے نام کی منادی کرنے لگا تو:-

> "سب سننے والے حیران ہو کر کہنے لگے کہ کیا یہ وہ شخص نہیں جو یروشلم میں اس نام کے (مسیحؑ کا نام) لینے والوں کو تباہ کرتا تھا اور یہاں بھی اس لئے آیا تھا کہ ان کو باندھ کر سردار کاہن کے پاس لے جائے۔" (رسولوں کے اعمال باب نمبر۹ آیت نمبر۲۱)

اب اس شخص (پولوس) نے ایک کہانی گھڑی یہ کہانی بھی " رسولوں کے اعمال " میں موجود ہے کہانی یہ تھی کہ وہ دمشق کے قریب پہنچا ہی تھا کہ آسمان سے نور کا ایک ہالہ اس پر نازل ہوا اس نور نے اس کے گردو پیش کو روشن کر دیا اس کی ہیبت سے وہ زمین پر گر پڑا اس نور میں سے آواز آئی " اے ساؤل! اے ساؤل تو مجھے کیوں ستاتا ہے؟ " اس نے پوچھا اے خداوند تو کون ہے؟ نور میں سے جواب آیا " میں یسوع ہوں جسے تو ستاتا ہے۔ " کہانی آگے چلتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے ساؤل (پولوس) کو معاف کر دیا۔ نہ صرف معاف کر دیا بلکہ اسے اپنے منتخب رسولوں میں شامل کر لیا اور حکم دیا کہ قریہ قریہ اور شہر شہر جا کر میرے نام کی منادی کرے۔ اس طرح پولوس نے مسیحیت کا چولہ اوڑھ کر خود کو حضرت مسیحؑ کے مقرب شاگردوں میں شامل کر لیا۔ اپنی غیر معمولی خطیبانہ صلاحیت، اپنے علم و فضل اور اپنی غیر معمولی ذہانت و فراست سے اس نے ان مسیحیوں کو جو نیا نیا ایمان لائے تھے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اب وہ مسیحیت کا مسلمہ رہنما اور مقدس روحانی پیشوا بن چکا تھا۔ اپنا بھرم اور اعتماد قائم کرنے کے بعد اب پولوس نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا آغاز کیا اور بہت ہوشیاری سے حضرت مسیحؑ کی تعلیم میں اپنے خود ساختہ عقائد داخل کرنے شروع کئے۔ اس نے ختنے کو غیر ضروری قرار دیا، شریعت کی پابندیوں کو ناواجب ٹھہرایا اور یہ عقیدہ گھڑا کہ انسان بنیادی طور پر گنہگار ہے یسوع نے صلیب پر جان دے کر امت کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا اور پھر وہ مع جسم آسمان کی طرف اٹھایا گیا جہاں وہ خدا کے دائیں طرف بیٹھا ہے۔

پولوس کی مخالفت

پولوس کے یہ بدعتی عقائد حضرت مسیحؑ کے سچے متبعین کو سخت ناگوار گزرے انہوں نے پولوس سے اختلاف کیا اور اسے ان عقائد کی تبلیغ سے روکا۔ اس اختلاف نے آگے بڑھ کر بہت نازک صورت اختیار کر لی۔ مورخ رابرٹ گریوز لکھتا ہے کہ:۔

" حضرت مسیحؑ کے مخلصین کی جماعت نے بھی جو " نظارین " (NAZARAENE) کے نام سے مشہور ہوئی پولوس پر سخت لے دے کی اور اس پر دین مسیحی کی توہین کا الزام

"JESUS IN ROME," P-36

یہی مورخ پولوس کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے کہ " آخر کار پولوس نے حضرت مسیحؑ کے مخلصین کی جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی اور فیلونزم (PHILO NISM) نامی فرقے میں شامل ہو گیا۔ اس نے دوسری بار پھر اپنا نام تبدیل کیا اور پولوس کی بجائے " پال " رکھ لیا۔ کچھ عرصے کے لئے تو اس نے یہودیوں کے مشہور فرقے " فریسی " کے عقائد اختیار کر لئے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر مذہب ہی سے (مکمل طور پر نہیں) قریب قریب منحرف ہو گیا لیکن اس کے باوجود حضرت مسیحؑ کے آسمان پر جانے اور وہاں سے واپس آنے کا عقیدہ ترک نہیں کیا "

"JESUS IN ROME," P-30

اس دوران میں بعض مسیحیوں نے اشتعال میں آ کر اسے قتل کرنے کی کوشش کی (جسے انجیل کے اضافی باب " رسولوں کے اعمال " میں یہودیوں کی سازش کا نام دیا گیا ہے) مگر پولوس کے شاگردوں نے جن کی خاصی بڑی تعداد دمشق میں موجود تھی اس کی امداد کی اور وہ ایک ٹوکرے میں چھپ کر دمشق سے فرار ہو گیا۔

" رسولوں کے اعمال " باب نمبر۹ آیت نمبر۲۳

پولوس چودہ سال تک ترکی اور یونان کے دورے کرتا اور اپنا خود ساختہ مذہب پھیلاتا رہا۔ واپسی پر حضرت مسیحؑ کے بزرگ صحابی جناب یعقوب سے بھی پولوس کا اختلاف ہوا۔ اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ پولوس شریعت کی پابندیوں کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔

آج یورپ کے مسیحی ہر قسم کی اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو کر جو فاسقانہ، بے قید اور بے راہ روی کی زندگی گزار رہے ہیں اس کا بانی یہی پولوس تھا چنانچہ مسیحیوں کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت مسیحؑ کی پاکیزہ شریعت پر یوں حملہ آور ہوتا ہے:۔

شریعت پر لعنت

" شریعت کے وسیلے سے کوئی شخص خدا کے نزدیک راست باز

نہیں ٹھہر سکتا ______ شریعت کو ایمان سے کچھ واسطہ نہیں مسیحؑ جو ہمارے لئے لعنتی بنا اس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا"

(گلیتون باب نمبر۳ آیت نمبر۱۱)

ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ:۔

"جتنے (لوگ) شریعت کے اعمال پر تکیہ کرتے ہیں سب کے
سب لعنت کے ماتحت ہیں۔"

(گلیتون باب نمبر۳ آیت نمبر۱۰)

بزرگ حواری جناب یعقوب جو حضرت مریمؑ کے بیٹے اور اس رشتے سے حضرت مسیحؑ کے بھائی تھے اس قسم کی مکروہ اور غلیظ تعلیم کو کیسے برداشت اور پسند کر سکتے تھے؟ انہوں نے پولوس کی مخالفت کی اور اسے ایسی حرکات سے روکا چونکہ حضرت مسیحؑ فلسطین سے ہجرت کرتے وقت جناب یعقوب کو اپنا قائم مقام بنا گئے تھے اور لوگ انہی کی طرف رجوع کرتے تھے، یہ بات بھی پولوس کے مقاصد اور عزائم کے خلاف تھی وہ تو خود اپنی قیادت اور پیشوائی کا ڈول ڈال رہا تھا پس اس نے جناب یعقوب اور ان کے شاگردوں پر جو سچے مسیحی تھے خوب لے دے کی اور سخت سست کہا۔ تفصیل کے لئے:۔

(گلیتوں باب نمبر۲ آیت نمبر۱ تا ۳)

پولوس مسیحی مورخوں کی عدالت میں

اس طرح پولوس نے مسیحیت میں بہت بڑا فتنہ برپا کیا اور حضرت مسیحؑ کی امت کو سخت ترین گمراہی میں مبتلا کر دیا مسیحی مورخ مسٹر ہولگر کرسٹن پولوس کی شخصیت اور کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"مسیحیت کی تاریخ میں پولوس کا نام حضرت مسیحؑ کے شاگردوں کے ساتھ کہیں نظر نہیں آتا، اس کے متعلق ہمیں انجیل میں شامل کچھ خطوط سے معلومات حاصل ہوتی ہیں جن میں سے بیشتر خود پولوس کے لکھے ہوئے ہیں اور ان میں تعصب تنگ نظری اور جعل سازی کا بہت دخل ہے۔ دراصل موجودہ عیسائیت پولوس کے ایجاد کردہ ضابطوں اور مصنوعی مذہبی عقائد کا مجموعہ ہے اور "پال" (پولوس) کی اس تعلیم کو "پالینزم" (PAULINISM) ہی کا نام دیا جا سکتا ہے۔"

"JESUS LIVED IN INDIA" P-28,29

یہی مورخ لکھتا ہے کہ "پالی نزم" کے معنی ہیں یسوع کی اصلی تعلیمات کا غلط سلط مطلب نکالنا اور ان کی طرف جعلی اور من گھڑت باتیں منسوب کرنا جس طرح پال (پولوس) نے کیا تھا۔ (صفحہ نمبر۲۹)

مسیحیت کا ایک فاضل مورخ "ول ہیلم نسٹل" (WILHELM NESTLE) پولوس کی تحریک کا جائزہ لینے کے بعد لکھتا ہے کہ "عیسائیت ایک ایسا مذہب ہے جس کی بنیاد پال (پولوس) نے رکھی تھی اس طرح حضرت مسیحؑ کی اصل اور حقیقی تعلیم تو پس منظر میں چلی گئی اور اس کی جگہ پولوس کی تعلیم نے حاصل کر لی۔"

مسیحیت کے بلند پایہ عالم دین اور مورخ مسٹر اوور بیک (OVER BECK) نے پولوس کی تحریروں اور اس کی زندگی کے حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ تمام اچھی باتیں اور پاکیزہ تعلیمات تو یسوع کی ہیں اور جو بری اور بے حقیقت باتیں ہیں وہ سب پولوس کی اپنی ایجاد کردہ ہیں۔ خداوند (یسوع مسیح) کی اذیت ناک موت کے ذریعے نجات کا عقیدہ پولوس کے دماغ کی پیداوار ہے۔ پولوس نے یہ عقیدہ ابتدائی سامی مذہب سے اخذ کیا تھا جس کی رو سے والدین اپنی نجات کے لئے اپنے سب سے بڑے بچے کو قربان کر دیتے تھے اس طرح اس کا خون ان کی نجات کا باعث بنتا تھا چنانچہ پولوس نے بھی انسان کے پیدائشی طور پر گنہگار ہونے کا عقیدہ گھڑا اور اس عقیدے پر باپ، بیٹا، روح القدس یعنی تثلیث کے عقیدے کی بنیاد رکھی۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے انگریز فلسفی لارڈ بولنگ بروک (LORD BOLING BROKE) نے عہد نامہ جدید کی روشنی میں عیسائیت کا تجزیہ کیا اور لکھا کہ انجیل عیسائیت کے نام سے دو مذاہب کی نشاندہی کرتی ہے ایک مذہب حضرت مسیحؑ کا اور دوسرا پال (پولوس) کا۔ اسی طرح فلسفی کانٹ (KANT) لیسنگ (LESSING) فچٹے (FICHTE) اور شیلنگ

(SCHELLING) نے بہت وضاحت سے یسوع کی تعلیم اور شاگردوں کی تعلیم کے درمیان خط امتیاز کھینچا ہے (شاگردوں سے یہی نام نہاد شاگرد پولوس اور اس کے ساتھی مراد ہیں۔) مسٹر ہولگر کرسٹن لکھتے ہیں کہ:-

"پال (پولوس) بہت ہی متعصب شخص تھا اور اس میں تو کچھ شک نہیں کہ حضرت مسیحؑ کے اصل حواریوں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ نہایت کٹر فرقہ پرست تھا۔ وہ مسیحیت کے منکروں اور اس پر ایمان رکھنے والوں کے درمیان بہت بڑی خلیج حائل کر گیا۔ اس نے یسوع کی تعلیمات کی بے حرمتی اور مخالفت کی اور انہیں اتنے اونچے درجے پر بٹھا دیا جو خود یسوع اپنے لئے ہرگز پسند نہیں کرتے تھے اور انہیں یسوع سے کرائسٹ (CHRIST) یعنی نجات دہندہ بنا دیا۔ اگر کبھی حضرت مسیحؑ کی حقیقی اور دانشمندانہ تعلیم کا سراغ لگ گیا تو یقینی طور پر ہمیں ان جعلی اور نقلی عقائد کو مسترد کرنا پڑے گا جو آج تک مسیحیت کے نام پر (پولوس کی تعلیمات کی صورت میں) مقدس، قابل احترام اور ناقابل تنقید سمجھے جاتے ہیں اسی صورت میں ہم اس تعلیم کی طرف رجوع کر سکیں گے جس کا سر چشمہ حضرت مسیحؑ کی ذات تھی"۔

CHAPTER "THE WITNESS PAULL" P-28. BY HOLGER.

مسٹر ہولگر کہتے ہیں کہ "اب بھی کچھ زیادہ مشکل نہیں کہ پال (پولوس) کی گھڑی ہوئی تعلیم سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے"

یہ ہے پولوس کے کردار کے بارے میں وہ مختصر سا جائزہ جو غیر جانبدار اور منصف مزاج مسیحی مورخوں اور عالموں کی تحریروں کی روشنی میں پیش کیا گیا۔ اس جائزے کی رو سے مسیحیت کی تعلیمات میں باپ، بیٹا، روح القدس کا عقیدہ یعنی عقیدۂ تثلیث داخل کرنے والا یہی پولوس یہودی تھا، حضرت مسیحؑ کے کفارے کا عقیدہ سب سے پہلے اسی پولوس یہودی نے گھڑا اور حضرت مسیحؑ کو آسمان پر بٹھانے کا عقیدہ اسی پولوس یہودی کے ذہن کی اختراع تھی۔

اس کی اصل وجہ یہی تھی کہ اسے معلوم تھا کہ مسیحیت کے نام سے جو عمارت وہ کھڑی کر رہا ہے یہ قائم نہیں رہ سکتی اگر اس کی بنیاد میں حضرت مسیحؑ کو آسمان پر اٹھائے

جانے کا عقیدہ موجود نہ ہو چنانچہ وہ خود کہتا ہے کہ:-

"اگر یسوع کو اوپر نہیں اٹھایا گیا تو تمہارا ایمان بے فائدہ ہے اور تم بدستور اپنے گناہوں میں ڈوبے ہوئے ہو" (کرنتھیوں باب نمبر ۱۰ آیت نمبر ۱۷)

اگر غور کیا جائے تو یہ ایک خوفناک سازش تھی جس کا منصوبہ اس کٹر یہودی پولوس نے تیار کیا تاکہ حضرت مسیحؑ سے انتقام لیا جا سکے۔ پولوس جانتا تھا کہ کسی نبی کو آسمان پر اٹھائے جانے کا عقیدہ یہودی عقیدہ ہے۔ وہ یہ عقیدہ مسیحیت کی تعلیم میں شامل کر کے مسیحیت کو یہودیت کا ضمیمہ بنانا اور مسیحیوں کے ذہنی پیکر میں یہودیت کی روح ڈالنا چاہتا تھا جس میں وہ حیرت انگیز طور پر کامیاب ہوا۔ پولوس کھلم کھلا یہودی کی حیثیت سے یہ کام نہیں کر سکتا تھا پس اس نے مسیحیت کا لبادہ اوڑھ کر مسیحیت کی عمارت میں سرنگ لگا دی۔ اسی لئے مسیحیت کے مورخ مسٹر ہولگر کرسٹن کو کہنا پڑا کہ اگر ہم حضرت مسیحؑ کی اصل تعلیم کی طرف رجوع کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ پولوس کی خود ساختہ مسیحیت سے کنارہ کشی اختیار کر لیں۔"

زیر نظر کتاب اس نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی ہے کہ حضرت مسیحؑ کی زندگی کے بارے میں جو مبالغہ آمیز تصورات رواج پا گئے ہیں ان کی حقیقت معلوم کی جائے اور تاریخ کے واقعات کو تاریخ کے طور پر پیش کیا جائے نہ کہ دیو مالائی داستان کے طور پر۔ امید ہے کہ حقائق پسند طبائع آج نہیں تو کل ان حقائق کو تسلیم کر لیں گی کیونکہ صداقت سے ہمیشہ کے لئے روگردانی اختیار نہیں کی جا سکتی۔

پیام شاہجہان پوری

این/۲۳ عوامی فلیٹس ریواز گارڈن لاہور (54000)

۲۷ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ (یکم اپریل ۱۹۹۲ء)

ٹیلی فون نمبر 322313

بن باپ پیدائش

ایک کنواری عورت نے دعویٰ کیا کہ اس نے جس بچے کو جنم دیا ہے، یہ ناجائز نہیں بلکہ جائز بچہ ہے، یہ خالصتاً" اس کا اپنا بچہ ہے، اس کی پیدائش میں کسی مرد کا دخل نہیں ہے۔ سماج اور عدالت دونوں نے اس کا دعویٰ مسترد کر دیا اور اسے زانیہ کا لقب دے کر ذلیل و خوار کر دیا حالانکہ وہ عورت سچی تھی۔ آخر کار رسوائی کے ساتھ زندہ رہنے کے مقابلے میں وہ موت کو ترجیح دینے پر مجبور ہو گئی کیونکہ اس کے لئے اور کوئی راستہ نہ تھا۔

ایسے ایک نہیں بہت سے واقعات پیش آئے اور اس صدی کے اوائل تک ساری دنیا بحیثیت مجموعی اس نظریہ پر سختی سے قائم رہی کہ مرد سے قربت کے بغیر عورت حاملہ نہیں ہو سکتی۔ یہی نظریہ تھا جس نے حضرت مسیحؑ کو خدا بنا دیا کیونکہ جناب مسیحؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے اور کہا گیا کہ کوئی عورت اس وقت تک بچہ پیدا نہیں کر سکتی جب تک مرد اس کے پاس جا کر مخصوص عمل سرانجام نہ دے، چونکہ جناب مسیحؑ کی ولادت سے قبل حضرت مریمؑ کو کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا تھا اس سے ثابت ہوا کہ جناب مسیحؑ خدا کے بیٹے تھے۔

خود ساختہ سنت اللہ

بعض مسلمان بھی اس نظریئے سے اس لئے متاثر ہو گئے کہ قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے کہ "تم اللہ کی سنت میں تبدیلی نہیں پاؤ گے۔" انہوں نے اس آیت شریفہ

سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ سنت اللہ یہی ہے کہ جب تک مرد عورت کے پاس جا کر ایک مخصوص عمل سرانجام نہ دے اس وقت تک بچہ پیدا نہیں ہو سکتا یہ ہمارا (یعنی ان کا) رات دن کا مشاہدہ ہے اس طرح انہوں نے خود ہی اس کو سنت اللہ قرار دے دیا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی اسے اپنی سنت قرار نہیں دیا، یہ ان کے اپنے دماغ کی اپج اور ذہنوں کی اختراع تھی۔

اسی نظریئے نے حضرت مسیحؑ کو آسمان پر بٹھانے میں بنیادی رول ادا کیا اور کہا گیا کہ حضرت مسیحؑ کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ کا معاملہ منفرد اور خصوصی نوعیت کا تھا۔ ان سے قبل اور ان کے بعد کوئی شخص بغیر باپ کے پیدا نہیں ہوا۔ یہ شرف صرف ان ہی کو عطا ہوا اس لئے اگر انہیں آسمان پر اٹھا لیا گیا تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اس سے قبل بھی اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ایک خصوصی نوعیت کا معاملہ کر چکا ہے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا کئے گئے تھے حالانکہ یہ معاملہ خصوصی نوعیت کا ہرگز نہیں تھا صرف ان کے ساتھ مخصوص نہیں تھا اس کی اور بھی نظیریں موجود ہیں۔

ہم نے اپنی گذشتہ کتاب "مسیحؑ کا سفر زندگی" میں اس امکان کا اظہار کیا تھا کہ عنقریب میڈیکل سائنس ایسے حقائق بے نقاب کرے گی جن سے ثابت ہو جائے گا کہ مرد کی قربت کے بغیر بھی عورت حاملہ ہو سکتی ہے اور یہ امر ہرگز سنت اللہ کے خلاف نہیں، چنانچہ زیر نظر کتاب کی تحریر و تالیف کے دوران ایسے حقائق تک ہماری رسائی ہو گئی جو روایت پرست لوگوں کے لئے یقیناً حیران کن ہوں گے لیکن اللہ تعالیٰ کی لامحدود قدرتوں پر یقین رکھنے والوں کے لئے ان میں تحیر کا شائبہ تک نہیں۔ ذیل میں ان حقائق کو ممکن حد تک آسان زبان اور عام فہم پیرائیہ اظہار میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

عورت کا مردانہ جرثومہ؟

سائنس کسی امر کو اس وقت تک قبول نہیں کرتی جب تک کہ تجزیہ و تجربہ اس کی تائید و تصدیق نہ کر دے۔ کوئی بھی نظریہ اس وقت تک محض دعویٰ ہے جب تک اس کا عملی ثبوت

موجود نہ ہو، جب اس کا مشاہدہ ہو جائے تو وہ سائنس بن جاتا ہے چنانچہ علم الحیات کے ماہرین نے شہادت دی اور دنیا کو ایسے واقعات سے روشناس کروایا جن سے ثابت ہو گیا کہ مرد سے قربت کے بغیر بھی عورت حاملہ ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں علم الحیات کے مشہور ماہر ڈاکٹر والٹر ٹمے (Dr. Walter Timme) نے سال ہا سال کی تحقیق و مشاہدہ کے بعد ثابت کیا کہ بعض عورتوں (لاکھوں میں ایک دو) کے زیر ناف (پیڑو کے نچلے) حصے میں ایسے ٹیومرز (Tumors) پیدا ہو جاتے ہیں جن میں مردانہ مادۂ تولید پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے اگر اس مردانہ مادۂ تولید (جرثوموں) میں زندگی موجود ہو اور یہ عورت کے مادۂ تولید سے جا ملیں تو عورت کا حاملہ ہو جانا نہ صرف ممکن بلکہ لازمی ہے اس میں کوئی غیر منطقی یا حیران کر دینے والی بات ہرگز نہیں۔ اس مادۂ تولید کو جو کسی عورت میں شاذ و نادر ہی پیدا ہوتا ہے آرہنو بلاس ٹوما (Arrheno Blass Toma) کہتے ہیں۔

بیس شہادتیں

ڈاکٹر والٹر ٹمے نے نشاندہی کی کہ صرف یورپ میں ایسے واقعات (Cases) کی تعداد کم سے کم بیس ہے جو ریکارڈ پر موجود ہیں یعنی ایسی بیس عورتوں کا معائنہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان کے زیر ناف حصہ جسم میں زنانہ مادۂ تولید (Cell) کے ساتھ ساتھ مردانہ مادۂ تولید بھی پیدا ہو گیا تھا ان دونوں کے ملاپ کے نتیجے میں عورت کا حاملہ ہو جانا قطعاً" غیر ممکن نہیں خواہ اسے مرد نے ہاتھ نہ بھی لگایا ہو اس صورت میں عورت کا اپنا جسم وہی عمل سرانجام دیتا ہے جو مرد کا جسم عورت کے قریب جا کر سرانجام دیتا ہے گویا عورت خود ہی باپ اور خود ہی ماں بن جاتی ہے یعنی جس طرح مرد، عورت سے ملاپ کر کے اپنا نطفہ اس کے رحم میں ڈال دیتا ہے یہاں عورت مرد سے ملاپ کے بغیر وہی فریضہ سرانجام دے دیتی ہے یعنی اس کے نچلے حصہ جسم میں موجود دونوں مادے (نر اور مادہ) باہم مل جاتے ہیں جس سے وہ حاملہ ہو جاتی ہے (اگر اس کے پیٹرو کے نیچے ٹیومر پیدا نہ ہو تو وہ ہرگز حاملہ نہیں ہو سکتی (1)

دو اور ڈاکٹروں نے اس موضوع پر تحقیق کرنے کے بعد لکھا کہ ایسے بہت سے بچے

پیدا ہوئے جن کی مائیں کنواری تھیں، ایک لڑکی جو نہایت پاکیزہ اخلاق و کردار کی مالک تھی، حاملہ ہو گئی در آں حالیکہ وہ سرے سے کسی ایسے فعل کے قریب بھی نہیں گئی تھی جو عورت کو حاملہ کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔ ان ہی ڈاکٹروں کے پاس ایک غیر شادی شدہ عورت کے حاملہ ہونے کا ایک اور کیس (Case) آیا جس نے واضح الفاظ میں کسی بھی مرد سے ناجائز تعلق پیدا کرنے سے انکار کیا (جبکہ یورپ میں اس اعتراف میں کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا وہاں ہر عورت صاف صاف بتا دیتی ہے اور نہ ایسے امور چھپا کرتے ہیں) اس عورت نے ایک تندرست بچی کو جنم دیا۔ (2)

برطانیہ کی معصوم لڑکی

کیا کوئی شخص دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس نے قدرت کے کمالات کا احاطہ کر لیا ہے؟ دنیا میں آئے دن جو محیر العقول واقعات پیش آتے ہیں ان کا مشاہدہ ہمیں مشورہ دیتا ہے کہ بعض ناقابل یقین واقعات کو ناممکن قرار دینے میں احتیاط سے کام لینا چاہئے اور فوراً حکم نہیں لگا دینا چاہئے۔ چنانچہ نومبر ۱۹۵۵ء کا واقعہ ہے کہ برطانیہ کی ایک نہایت سیدھی سادھی لڑکی نے جو ابھی غیر شادی شدہ تھی یہ حیرت ناک کہانی سنائی کہ اس نے جس بچی کو جنم دیا ہے اس کا کوئی دنیاوی باپ نہیں۔ یہ لڑکی زمانہ حال کے جدید سائنسی انکشافات سے بھی بے بہرہ تھی۔ کیا کوئی ڈاکٹر، کوئی جج یا کوئی خاوند یقین کر سکتا ہے کہ ایک لڑکی نے ایسے بچے کو جنم دیا ہے جس کا نہ کوئی باپ ہے اور نہ اس لڑکی کو کسی مرد نے ہاتھ لگایا ہے لیکن اس کے باوجود برطانوی سائنس دانوں کی ایک جماعت نے اس لڑکی کے مکمل ٹیسٹ لینے کے بعد یہ حیران کن فیصلہ دیا کہ "ہم اقرار کرتے ہیں کہ اس لڑکی کا بیان مسترد نہیں کیا جا سکتا۔" یعنی اس کا یہ دعویٰ سچا ہے کہ اس نے کنواری ہوتے ہوئے بچہ کو جنم دیا ہے در آں حالیکہ اسے کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا بلاشبہ عام حالات میں یہ واقعہ ناقابل یقین ہے کیونکہ ہمارا تصور یہی ہے کہ جب تک مرد اور عورت یک جا ہو کر ایک مخصوص عمل سرانجام نہ دیں اس وقت تک بچہ پیدا نہیں ہو سکتا لیکن اب سائنس

دانوں نے ثابت کر دیا ہے کہ ایسا ممکن ہے اگرچہ لاکھوں کروڑوں میں کہیں ایک واقعہ رونما ہوتا ہے۔

چھبیس نظیریں

گذشتہ چند سال قبل برلن کے پروفیسر رابرٹ مئیر (Robert Mayer) نے یورپ میں ٹیومر (Tumor) کے چھبیس کیس درج کئے جن میں ان عورتوں کا معائنہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان کے نچلے حصہ جسم میں ایسی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے جس سے یہ خود بخود حاملہ ہو سکتی ہیں یعنی ان میں مرد کا مادۂ تولید بنانے والا ٹیومر پیدا ہو چکا ہے۔ امریکہ میں ایسا صرف ایک کیس ریکارڈ کیا گیا جو ایک اٹھارہ سالہ لڑکی کا تھا۔ اسی طرح ڈاکٹر والٹر ٹمے (Dr. Walter Timme) نے اپنے تحقیقی مقالے میں ایک ایسی لڑکی کی نشاندہی کی ہے جس کی ماہواری اچانک رک گئی پھر اس میں مردانہ علامات ظاہر ہونے لگیں اور اس کے اوپر والے ہونٹ پر بال اگنے لگے پھر اس کے پیٹ میں ایک ٹیومر پیدا ہو کر بڑھنے لگا جسے آپریشن کر کے نکالا گیا۔ اس ٹیومر کا بغور معائنہ کرنے کے بعد اسے پروفیسر رابرٹ مئیر کے پاس ان کی ماہرانہ رائے حاصل کرنے کی غرض سے بھیجا گیا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں رائے دی کہ اس میں مادۂ تولید کے جراثیم موجود ہیں یعنی اس ٹیومر میں ایسے جراثیم پائے جاتے ہیں کہ اگر عورت کے بیضے سے جا ملیں تو عورت حاملہ ہو جائے (3)

سادہ الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ سائنس بلکہ مشاہدے نے ثابت کر دیا کہ کبھی کبھی عورت کے رحم میں مرد کے تولیدی جرثومے پیدا ہو جاتے ہیں اور جس طرح عام حالات میں ایک شادی شدہ عورت کے رحم میں اس کے شوہر کا مادۂ تولید پرورش پاتا ہے اسی طرح ایک غیر شادی شدہ عورت کے رحم میں شاذونادر کے طور پر اس کا اپنا مردانہ مادۂ تولید پرورش پاتا ہے اور دونوں قسم کے مادوں کے ملنے سے ایک بے عیب حمل ٹھہر جاتا ہے، بے عیب اس لئے کہ وہ ناجائز نہیں ہوتا اگرچہ لڑکی بدستور کنواری ہوتی ہے ظاہر ہے کہ اس کی کوئی مسلمہ وجہ بیان نہیں کی جا سکتی۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اب تک ہر شخص یہی سمجھتا اور کہتا تھا کہ کوئی عورت اس وقت تک حاملہ نہیں ہو سکتی جب تک مرد کا کم از کم ایک جرثومہ اس کے رحم میں داخل نہ ہو جائے اس سے اختلاف کرنے کو پاگل پن یا جہالت قرار دیا جاتا تھا لیکن علم الحیات کے ماہرین اور زنانہ امراض کے محققین نے اب جو شواہد پیش کئے ہیں ان کی رو سے ایسا ممکن ہے کہ عورت مرد سے قربت کئے بغیر بھی حاملہ ہو جائے اگرچہ لاکھوں کروڑوں میں کوئی ایک۔ ان ماہرین کی تحقیق و مشاہدہ کی رو سے شاذو نادر کے طور پر مادۂ تولید ریڑھ کی ہڈی میں بھی پیدا ہو جاتا ہے جو عام حالات میں اس کی اصل جگہ نہیں ہوتی اسے ہم کیا کہیں گے؟ کیا یہ حیران کن بات نہیں؟ اگرچہ ناممکن نہیں، مگر نادر الوجود ضرور ہے۔

بعض لوگ اس خدشے کا اظہار ضرور کریں گے کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مرد سے جسمانی تعلق قائم کئے بغیر بھی عورت حاملہ ہو سکتی ہے تو دنیا میں بدکاری کا دروازہ کھل جائے گا لیکن یہ خدشہ محض وہم ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں اور آج تک ایسا ایک واقعہ بھی پیش نہیں آیا کہ کسی ناجائز بچے کی ماں نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ اسے کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا اور اس کا بچہ محض خدا کی قدرت سے پیدا ہوا ہے۔ اتنا بڑا جھوٹ کوئی نہیں بول سکتا۔ دوسری بات یہ کہ اب ایسے حساس ترین آلات ایجاد ہو چکے ہیں اور ایسے طریقے دریافت کر لئے گئے ہیں جن کے ذریعے سے عورت کے ٹیسٹ لے کر یہ معلوم کرنا بالکل آسان ہو گیا ہے کہ فلاں عورت اپنے دعوے میں سچی ہے یا جھوٹی؟ پس علم الحیات کی رو سے اگر کنواری کے پیٹ سے بچہ پیدا ہونے کے امکان کو تسلیم کر لیا جائے تو یقینی طور پر ایسے بہت سے واقعات رونما ہوئے ہوں گے جن کا ہمیں علم ہی نہیں ہو سکا کیونکہ یہ عام سمجھ کی بات ہے کہ اگر کسی کنواری لڑکی کے حمل قرار پائے تو وہ اپنی بدنامی کے خوف سے اسے چھپانے کی کوشش کرے گی۔ اسے احساس ہو گا کہ کوئی بھی شخص اس کے دعوے اور بیان پر یقین نہیں کرے گا چنانچہ وہ اس حمل سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرے گی۔ زمانہ قدیم کی کتابوں میں ہمیں ایسے واقعات ملتے ہیں کہ بعض عورتوں نے اصرار کیا کہ ان کے بچے کسی بھی مرد سے تعلق کے بغیر پیدا ہوئے ہیں لیکن

سماج اور عدالتی انصاف دونوں نے انہیں جھوٹا اور گنہگار ٹھہرایا اس طرح بہت عرصے
تک ایسی عورتوں پر ظلم ہوتا رہا لیکن جدید سائنسی تحقیقات سے اب صورت حال یکسر
تبدیل ہو چکی ہے۔

گویا اب یہ بت ٹوٹ چکا ہے کہ مرد سے تعلق قائم کئے بغیر عورت بچے کی ماں نہیں
بن سکتی اور اگر ایسی کسی عورت کے بچہ پیدا ہو جائے تو وہ خدا کا بیٹا ہو گا۔ اب ثابت ہو
گیا ہے کہ ایسی بہت سی بیٹیاں اور بیٹے پیدا ہو چکے ہیں جن کے باپ نہیں تھے اور ان کی
ولادت بھی جائز تھی یعنی وہ کسی حرام کاری کے بغیر پیدا ہوئے تھے' کیا وہ سب خدا کی
بیٹیاں اور بیٹے تھے؟ اگر ایسا تھا تو حضرت مسیحؑ کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہی۔

مسیحؑ کا واقعہ ولادت

یہ تو تھا سائنس کا نقطہ نگاہ لیکن جو لوگ مذہبی معاملات میں سائنس کے دخل کو جائز
نہیں سمجھتے' جو قرآن حکیم پر ایمان رکھتے ہیں اور صرف اسی سے رہنمائی کو کافی سمجھتے ہیں
ان کے لئے کتاب اللہ مین مکمل روشنی موجود ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ حضرت مسیحؑ بھی
بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ

(آل عمران آیت نمبر ۴۵ تا ۴۸)

(یعنی' اس وقت کو یاد کرو جب فرشتوں نے کہا اے مریم اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے کلمے
کے ذریعے ایک بشارت دیتا ہے (جس کی بشارت دی جا رہی ہے) اس کا نام مسیح ابن مریم
ہو گا؟ یہ سن کر حضرت مریمؑ حیران ہو کر فرشتے سے پوچھتی ہیں کہ میرے ہاں بچہ کیسے ہو گا
کیونکہ:۔

وَلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ (مجھے کسی آدمی نے چھوا تک نہیں)

اس پر فرشتہ کہتا ہے کہ:۔

کذالک اللہ یخلق ما یشاء ط (ایسا ہی ہو گا کیونکہ) اللہ تعالیٰ جو چاہے پیدا کر سکتا ہے وہ
جس امر کے بارے میں فیصلہ کر لیتا ہے اس کے بارے میں صرف اتنا کہتا ہے کہ "کن"

یعنی "ہو جا" پس وہ ہو جاتا ہے)

حضرت مریمؑ اور فرشتے کے درمیان جو مکالمہ ہوا' آیئے اس کا تجزیہ کریں' اس پر
غیر جانبدارانہ غور و فکر کریں۔

(۱) حضرت مریمؑ کو فرشتہ بشارت دیتا ہے کہ آپ کو بیٹا عطا کیا جائے گا۔ حضرت مریمؑ
یہ سن کر حیرانی اور تعجب کا اظہار کرتی ہیں کہ انہیں تو کسی مرد نے ہاتھ تک نہیں لگایا پھر
ان کے ہاں بیٹا کیسے پیدا ہو گا؟ اس کے جواب میں فرشتہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے
پیدا کر سکتا ہے یعنی اے مریم! اگرچہ تجھے کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا مگر اللہ تعالیٰ اس
بات پر قادر ہے کہ وہ اس عورت کو بھی بیٹا عطا فرما دے جو کنواری ہو اور مرد جس کے
قریب بھی نہ گیا ہو۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب اور مفہوم صرف اتنا تھا کہ اے مریم! جب
تمہاری شادی ہو جائے گی اس کے بعد اللہ تعالیٰ تمہیں بیٹا عطا فرمائے گا۔ ان اصحاب نے
غور نہیں کیا۔ اگر اس کا مفہوم یہی تھا کہ حضرت مریمؑ کو شادی کے بعد بیٹا دیا جائے گا تو
اس میں نہ تو حضرت مریمؑ کے لئے کوئی تعجب کی بات تھی جس پر وہ پوچھتیں کہ یہ کیسے ہو
گا؟ اور نہ اس سے اللہ تعالیٰ کی کسی غیر معمولی قدرت کا اظہار ہوتا ہے کیونکہ شادی کے
بعد تو عام طور پر ہر گھر میں بچوں کی ولادت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے' کسی کے ہاں بیٹا
ہوتا ہے کسی کے ہاں بیٹی ہوتی ہے۔

(۲) اس مسئلہ پر یوں بھی غور کیجئے کہ اگر کوئی دست شناس کسی مرد یا عورت کا ہاتھ
دیکھ کر یہ خبر دے کہ تمہارے ہاں چار بیٹے یا تین بیٹیاں ہوں گی تو اس سے یہی سمجھا
جائے گا کہ دست شناس شادی کے بعد بیٹوں یا بیٹیوں کے پیدا ہونے کے بارے میں خبر
دے رہا ہے۔ دست شناس کی اس خبر پر کوئی شخص تعجب کا اظہار نہیں کرے گا کہ یہ بیٹے
اور بیٹیاں کیسے پیدا ہوں گی۔ پس اگر فرشتہ حضرت مریمؑ کو ایسے بیٹے کی ولادت کی خبر دیتا
جو شادی کے بعد پیدا ہونا تھا تو وہ اس پر تعجب اور حیرانی کا اظہار نہیں کر سکتی تھیں کیونکہ
ان کی منگنی ہو چکی تھی اور کچھ مدت کے بعد شادی ہونی تھی مگر اس کے باوجود وہ تعجب

اور حیرانی کا اظہار کرتی ہیں اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ جس بیٹے کی ولادت کی خبر دی
جا رہی تھی وہ مستقبل قریب میں پیدا ہونا تھا اور شادی سے قبل پیدا ہونا تھا۔ جس وقت
انہیں بشارت دی جا رہی تھی اس وقت وہ حاملہ ہو چکی تھیں جس کا انہیں علم نہیں تھا۔

(۳) پھر جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے اور کچھ مدت کے بعد وہ اسے لے کر اپنی قوم میں
واپس آتی ہیں تو قوم کے اکابر ان کے پاس آتے ہیں اور ان سے پوچھتے ہیں کہ:۔

یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا ○ (مریم آیت ۲۷)

(یعنی اے مریم تو نے یہ کیا کیا؟ یا تو نے یہ بہت برا کام کیا) اس کے بعد قوم کے اکابر
کہتے ہیں:۔

یٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِیًّا ○ (سورۂ مریم آیت ۲۸)

(یعنی اے ہارون کی بہن تیرا باپ تو برا آدمی نہ تھا نہ تیری ماں بدکار تھی)

اگر حضرت مریمؑ کی شادی ہو چکی ہوتی اور پھر بیٹا پیدا ہوتا تو آپؑ کی قوم کے لوگ
کبھی آپؑ پر الزام نہ لگاتے اور یہ نہ کہتے کہ اے مریم تو نے یہ بہت برا کام کیا ایسا کام
تیری ماں نے تو نہ کیا تھا وہ تو بدکار نہیں تھی۔ دوسرے الفاظ میں وہ حضرت مریمؑ پر (نعوذ
باللہ) بدکاری کا الزام لگاتے ہیں۔ کسی شادی شدہ عورت کے ہاں بچہ پیدا ہونے پر کوئی
صحیح الدماغ شخص اعتراض نہیں کرتا نہ بدکاری کا الزام لگاتا ہے پس قرآن کریم سے یہی
ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کی ولادت کے وقت تک حضرت مریمؑ کنواری تھیں اور
کنواری ہی کے گھر بچہ پیدا ہوا تھا۔ اگر حضرت مریمؑ کی شادی نہ ہو چکی ہوتی تو آپؑ اپنی
قوم کے لوگوں کا اعتراض سن کر انہیں مسکت جواب دیتیں کہ "تم لوگ کیسی بیہودہ اور
ناپاک باتیں کرتے ہو، میں تو شادی شدہ عورت ہوں، یہ میرا شوہر یوسف ہے، عیسیٰ اس کا
بیٹا ہے" مگر آپؑ یہ جواب نہیں دیتیں پس اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کی
ولادت تک حضرت مریمؑ کنواری تھیں قرآن اور انجیل دونوں اس پر متفق ہیں۔

(۴) تھوڑا سا اور غور کیجئے۔ جب حضرت مسیحؑ کی ولادت کا زمانہ قریب آتا ہے تو
حضرت مریمؑ اپنے وطن ناصرہ سے بیت لحم نامی قصبے میں چلی جاتی ہیں جو ناصرہ سے ایک سو

کلو میٹر دور جنوب کی طرف واقع تھا۔ انجیل میں بھی حضرت مسیحؑ کا مقام ولادت بیت
ہی کو بتایا گیا ہے (4)

قرآن حکیم بھی انجیل کی تصدیق کرتے ہوئے اشارہ کرتا ہے کہ حضرت مسیحؑ اپنے
وطن (والدہ کے شہر) میں پیدا نہیں ہوئے بلکہ کسی دور دراز مقام پر ان کی ولادت ہوئی
چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ:

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِیًّا ○ (مریم آیت نمبر ۲۲)

(یعنی حضرت مریمؑ) اپنا حمل اٹھائے ہوئے ایک دور کے مقام کی طرف چلی گئیں۔
یہاں پہنچ کر ہر صاحب فکر سوچتا ہے کہ حضرت مریمؑ کو اپنا گھر بار چھوڑ کر سو میل دور
جانے کی کیا ضرورت تھی، وہ بھی ایسے نازک موقع پر جب کہ بچے کی ولادت ہونے والی
تھی۔ یہ نئی بستی (بیت لحم) حضرت مریمؑ کے لئے بالکل اجنبی تھی جہاں ان کا کوئی عزیز،
رشتہ دار حتیٰ کہ واقف کار تک موجود نہ تھا چنانچہ قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ جب
حضرت مریمؑ کے درد زہ شروع ہوا تو:۔

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَاۤ اَلَّا تَحْزَنِیْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِیًّا ○ (مریم آیت نمبر ۲۴)

(تب پہاڑی کی نچلی طرف سے آواز آئی کہ (اے مریم) رنج نہ کر غمگین مت ہو
تیرے زیریں جانب ایک چشمہ بہہ رہا ہے اس کے قریب چلی جا اور جن کر فارغ ہو جا)
آگے چل کر فرماتا ہے کہ "اور کھجور کی ٹہنی پکڑ کر ہلا وہ تجھ پر تازہ پھل گرائے گی۔
یہ تازہ کھجور کھا اور چشمے کا مصفیٰ پانی پی کر قوت حاصل کر۔"

یہ آیات صاف بتا رہی ہیں کہ اس نئی جگہ (بیت لحم میں) حضرت مریمؑ کا کوئی رشتہ
دار، کوئی واقف کار نہ تھا۔ بچے کی پیدائش کے وقت ان کی امداد کے لئے دایہ تک موجود
نہ تھی یہ مرحلہ بھی انہیں خود ہی تنہا طے کرنا پڑا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی رہنمائی فرمائی کہ
فلاں جگہ چشمہ ہے وہاں چلی جاؤ نومولود کو بھی اور اپنے جسم کو بھی صاف کر لو۔
کھانے پینے کے لئے بھی کچھ نہ تھا چنانچہ خدا وند تعالیٰ نے انہیں ایسی جگہ پہنچا دیا
جہاں پھل سے بھرے ہوئے کھجوروں کے درخت اور شیریں پانی کا چشمہ تھا۔ اس طرح

حضرت مریمؑ نے تازہ کھجور کھا کر اور شیریں چشمے کا پانی پی کر اپنی ناطاقتی اور جسمانی کمزوری پر قابو پایا۔

سوچئے آخر حضرت مریمؑ نے اپنے آپ کو اس ابتلا اور آزمائش میں کیوں ڈالا اور ایسے نازک وقت میں جب عورت زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہوتی ہے انہوں نے ایک اجنبی بستی کو بچے کی ولادت کے لئے کیوں منتخب کیا؟ اس کی ایک ہی وجہ تھی کہ اس وقت تک حضرت مریمؑ کنواری تھیں اور انہیں احساس تھا کہ جب ان کے ہاں بچہ پیدا ہو گا تو بستی کے لوگ اور رشتہ دار الزام تراشیاں کر کے زندگی اجیرن کر دیں گے اور سخت رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا پس اس ابتلا اور رسوائی سے بچنے کی خاطر انہوں نے یہ دور دراز کا سفر اور کس مپرسی کی حالت کو قبول کیا۔

قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ جب حضرت مسیحؑ کی ولادت ہونے لگتی ہے تو حضرت مریمؑ فریاد کرتی ہیں کہ:-

يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ○ (مریم آیت نمبر ۲۳)

(یعنی اے کاش میں اس (واقعے) سے پہلے مرگئی ہوتی اور میری یاد تک مٹا دی جاتی) یہ آیت قرآنی ہمیں دعوت فکر دیتی ہے کہ آخر وہ کون سا واقعہ تھا جس کے بارے میں حضرت مریمؑ تمنا کرتی ہیں کہ کاش اس کے رونما ہونے سے قبل وہ مرگئی ہوتیں اور ان کا نام و نشان تک مٹا دیا گیا ہوتا۔ بلا شبہ وہ واقعہ یہی تھا جب وہ ایک بچے کو جنم دے رہی تھیں۔ بعض لوگ یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ حضرت مریمؑ کی آہ و زاری درد زہ کی وجہ سے تھی لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ درد زہ کے وقت کون سی عورت تکلیف سے بے قرار ہو کر آہ و زاری نہیں کرتی نہ یہ کوئی غیر معمولی اور عجیب بات ہے جس کا قرآن میں ذکر کیا جاتا۔ قرآن حکیم کسی واقعے کے بارے میں غیر ضروری تفاصیل بیان نہیں کرتا۔ دوسری آسمانی کتابوں میں بھی بعض انبیاء کی بیویوں کو بیٹا عطا ہونے کی بشارت دی گئی ہے مگر کسی کے درد زہ کا ذکر نہیں کیا گیا خود قرآن حکیم میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت زکریاؑ کی بیویوں کا ذکر کیا گیا ہے انہیں بھی فرزند عطا ہونے کی بشارت دی گئی ہے مگر ان

میں سے کسی کے درد زہ کی کیفیات بیان نہیں کی گئیں آخر صرف حضرت مسیحؑ کی ولادت سے متعلق یہ باریک در باریک تفاصیل بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کی ایک ہی وجہ تھی تاکہ لوگ اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ولادت مسیحؑ کے وقت حضرت مریمؑ کنواری تھیں اور حضرت مسیحؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔

حوالہ جات

(1) "The American Medical Journal" Quoted From "A Man That Is Called Jesus" P-46, 47 By A.R. Malabari

(2) Anomalies And Curiositles Of Medicine By George Mgould And Walter L Payle Saunders Andco London.

(3) The Transactions Of The American Neurological Association Vol. 60 (1934) PP. 85-86

(4) متی باب نمبر ۲ آیت نمبر ۱

مسیحؑ صلیب پر فوت نہیں ہوئے

مجرم بھوکا، پیاسا کئی دن صلیب پر لٹکتا رہتا تھا۔ گوشت خور جانور اس کا گوشت نوچ نوچ کر اسے موت کے منہ میں دھکیل دیتے تھے۔ بعض دفعہ موسم کی سختیاں مجرم کو ہلاک کر دیتی تھیں۔ اس دوران صلیب گاہ میں متعین پہریدار جوا کھیل کر اپنا دل بہلاتے تھے۔

یہودی دعوئی کرتے تھے کہ ہم نے مسیحؑ ابن مریم کو صلیب پر چڑھا کر مار دیا اور آج تک یہی کہہ رہے ہیں۔ مسیحی بھی یہی کہتے ہیں کہ ان کا "خدا" صلیب پر چڑھا دیا گیا، دونوں کہتے ہیں کہ وہ صلیب پر ہلاک ہو گیا حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

صلیب پر موت کی مدت؟

انجیل کہتی ہے کہ جناب مسیحؑ کے صلیب پر چڑھائے جانے کے بعد تمام ملک میں اندھیرا چھا گیا تاریکی کی یہ کیفیت دوپہر سے لے کر تیسرے پہر تک رہی (1)
تیسرے پہر کے قریب حضرت مسیحؑ نے شدید تکلیف کا اظہار کیا (انجیل کے بقول چیخ ماری) اور اس کے بعد آپؑ خاموش بلکہ نڈھال ہو گئے جسے انجیل میں "دم دینا" کہا گیا ہے۔ گویا جناب مسیحؑ دوپہر سے لے کر تیسرے پہر تک صلیب پر رہے یہی وقت تھا (یعنی تیسرے پہر کا) جب زلزلے سے زمین لرز اٹھی اور چٹانیں تڑخ گئیں (2)

تیسرے پہر کے بعد ہی یعنی شام کو یوسف ارمیتہ کی درخواست پر حضرت مسیحؑ کو صلیب سے اتار لیا گیا کیونکہ انجیل میں لکھا ہے کہ "جب شام ہوئی تو یوسف نامی ارمتیاہ کا ایک دولتمند آدمی جو پوشیدہ طور پر یسوع کا شاگرد تھا (گورنر) پیلاطوس کے پاس گیا اور اس سے حضرت مسیحؑ کی نعش مانگ لایا" (3)

گویا جب حضرت مسیحؑ کا جسم صلیب سے اتارا گیا تو رات نہیں ہوئی تھی سورج غروب نہیں ہوا تھا بلکہ ابھی شام تھی۔ اگر تھوڑا سا بھی غور کیا جائے تو یہ ساری مدت چار پانچ گھنٹے سے زیادہ ثابت نہیں ہوتی شاید اس سے کم ہی ثابت ہو یعنی دوپہر (بارہ بجے) سے تیسرے پہر (شام کے چار یا پانچ بجے) تک حضرت مسیحؑ صلیب پر رہے۔ چونکہ دوسرے دن "سبت" تھا جو یہودیوں کا مقدس دن ہے اور تورات کی رو سے سبت کے دن کوئی نعش صلیب پر نہیں رہنی چاہئے۔ (4)
یعنی جس روز حضرت مسیحؑ کو صلیب پر چڑھایا گیا لازمی طور پر اسی روز غروب آفتاب سے پہلے پہلے انہیں صلیب سے اتار لیا گیا اس طرح وہ چار پانچ گھنٹے سے زیادہ صلیب پر نہیں رہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا صلیب پر چار پانچ گھنٹے میں موت واقع ہو سکتی ہے؟ پھر یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ حضرت مسیحؑ کمزور جسم اور کمزور قویٰ کے آدمی نہیں تھے آپؑ قد آور شخص تھے حضرت مسیحؑ کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ تھا یعنی قریباً چھ فٹ اور وزن سوا دو من کے قریب تھا۔ (5)
دوسری تحقیق کے مطابق آپؑ کا قد پانچ فٹ چار انچ تھا (نیوز ویک ۲۹ اپریل ۱۹۶۸ء)
گویا بہت تنومند شخص تھے، عمر بھی بھرپور جوانی کی تھی اس عمر اور ایسے مضبوط جسم کے شخص کی موت (صلیب پر) تین چار یا پانچ چھ گھنٹے میں ہرگز واقع نہیں ہو سکتی مندرجہ ذیل حقائق اس کی تائید نہیں کرتے۔
پہلی بات یہ کہ صلیب عام پھانسی کی طرح کا کوئی پھندا نہیں ہوتا جسے گلے میں کس دیا جائے اور آدمی دم گھٹنے سے چند منٹ میں مر جائے بلکہ وہ ایک عمودی لکڑی ہوتی تھی جسے عمودی صورت میں زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا اس کے ساتھ افقی شکل میں ایک اور لکڑی پیوست کر دی جاتی تھی مجرم کے دونوں ہاتھوں (کلائیوں) اور پیروں میں کیلیں ٹھونک کر اس لکڑی کے ساتھ لٹکا دیا جاتا تھا جس پر وہ کئی کئی دن لٹکتا رہتا تھا، درد کی شدت، خوف اور بھوک پیاس کی وجہ سے آخر کار تین چار دن میں سسک سسک کر مر جاتا تھا۔ صلیب سے اتار کر اس کی ٹانگیں توڑ دی جاتی تھیں مگر انجیل کہتی ہے کہ حضرت مسیحؑ کی ٹانگیں نہیں توڑی گئی تھیں۔ (6)
صلیب کی سزا پانے والوں کے بارے میں جن اطبا اور ڈاکٹروں نے تحقیق کی ہے یا

جن لوگوں نے قریب سے ان کا مشاہدہ کیا ہے ان کی تحقیق کے نتیجے میں جو حقائق سامنے آئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) صلیب دینے کا ایک بڑا مقصد یہ ہوتا تھا کہ مجرم اذیت ناک حالت میں تین چار دن تک صلیب پر لٹکتا رہے اور اسی حالت میں موت کے منہ میں چلا جائے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور وہ دہشت زدہ ہو جائیں۔ ہاتھوں اور پیروں میں میخیں ٹھونکنے سے خون کے بہاؤ میں تو رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے لیکن اس سے موت واقع نہیں ہو سکتی۔ موت کا سبب بدن کی وہ غیر قدرتی اور تکلیف دہ پوزیشن ہوتی تھی جس میں وہ صلیب پر لٹکا رہتا تھا۔ مجرم کا دل اور دماغ اذیت ناک درد محسوس کرتے تھے اور بعض اعضائے بدن اپنا کام کرنا چھوڑ دیتے تھے (جو لوگ مضبوط صحت کے مالک ہوتے تھے وہ کئی کئی روز تک یہ اذیت برداشت کر لیتے تھے۔ ناقل) ان کی ہلاکت کی اصل وجہ بھوک اور پیاس ہوتی تھی۔ (7)

صلیب سے زندہ واپسی

(۲) اس شخص کے زندہ بچ جانے کا زیادہ امکان ہوتا تھا جسے زندہ حالت میں صلیب سے اتار لیا جاتا تھا اس حقیقت کا علم سب سے پہلے ایک رومی فوجی افسر جوزف (Joseph) کو حاصل ہوا۔ اس افسر نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ رومیوں کی طرف سے یروشلم کے محاصرے کے دوران سپہ سالار اعظم ٹائی ٹس (Titess) نے اسے "تکوا" کے کیمپ کا معائنہ کرنے کی غرض سے بھیجا یہ کیمپ شہر سے ۱۲ میل جنوب کی طرف واقع تھا واپسی میں وہ بہت سے قیدیوں کے پاس سے گزرا جنہیں صلیب کی سزا دی گئی تھی اس نے ان میں سے تین کو پہچان لیا جو اس کے واقف تھے واپس جا کر اس نے سپہ سالار اعظم کے سامنے ان کی سفارش کی چنانچہ ٹائی ٹس نے ان تینوں کو صلیب سے اتار کر ان کا علاج کرنے کے احکام جاری کر دیے ان میں سے دو تو مر گئے لیکن تیسرا صحت یاب ہو کر بچ گیا۔ یہ قیدی حضرت مسیحؑ سے کہیں زیادہ وقت تک صلیب پر لٹکتا رہا تھا مگر اس کے باوجود علاج معالجے کے نتیجے میں اس کی جان بچ گئی۔ (۸)

(۳) یہ بھی ضروری نہیں کہ صلیب پر چڑھایا جانے والا شخص جلد مر جائے بعض

دفعہ دو دو تین تین دن کے بعد موت واقع ہوتی تھی اور وہاں متعین چوکیدار جوا کھیلنے میں وقت گزارتے تھے (9)

(۴) اسی طرح مسٹر اسٹراؤڈ (Stroud) نے اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے بہت سے مثالیں دی ہیں اور بتایا ہے کہ وہ لوگ جو صلیب سے بروقت اتار لئے جاتے ہیں اور بڑی احتیاط سے ان کا علاج کیا جاتا ہے وہ بچ جاتے ہیں اکثر لوگ بھوک پیاس اور سردی گرمی کی شدت سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات گوشت خور جانور بھی مصلوب کا گوشت نوچ نوچ کر اسے ہلاک کر دیتے ہیں۔ (10)

چند اور شہادتیں

ایک ممتاز فوجی افسر کیپٹن کلیپرٹن (Captain Clapperton) جو سوڈان میں صلیب پر موت کے واقعات کا مشاہدہ کر چکا ہے بتاتا ہے کہ صلیب پر چڑھایا جانے والا شخص عام طور پر تین دن زندہ رہتا ہے تب کہیں جا کر اس تکلیف دہ حالت سے نجات پاتا ہے۔ ولیم حنا (Hanna) اپنی کتاب (Life of Christ) میں لکھتا ہے کہ صلیب پر لٹکایا جانے والا شخص زیادہ تر پہلے دن تو زندہ رہتا ہی ہے عام طور پر دوسرے دن بھی زندہ رہتا ہے اور بعض اوقات پانچویں اور چھٹے روز بھی زندہ رہتا ہے (11)

تاریخ میں ایک دور گزرا ہے جسے "اوریجن" (Origin) کا دور کہتے ہیں یہ آج سے سترہ سو سالہ قدیم دور تھا' تاریخ کا طالب علم جب اس دور پر نظر ڈالتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ قدیم تاریخ کے واقعات پر غور کرتا ہے تو اسے سخت حیرت ہوتی ہے کہ حضرت مسیحؑ صلیب پر اتنی جلد کیسے فوت ہو گئے۔ تاریخ کے طالب علم اسے ایک خلاف واقعہ امر خیال کرتے ہیں کیونکہ مصلوب شخص صلیب کی اذیت ناک کیفیت سے دو دن سے قبل نجات حاصل نہیں کر سکتا مسٹر ہائی نیک (Mr.Hynek) جیسے ممتاز ماہر کی رائے ہے کہ صلیب پر موت کی اصل وجہ پٹھوں کا تشنج ہے جو بہت سست رفتار سے اپنا کام کرتا ہے یعنی مصلوب فوری طور پر چند گھنٹوں میں نہیں مرتا بلکہ آہستہ آہستہ ہلاک ہوتا ہے۔ اس تشنج کے نتیجے میں بازوؤں میں سخت قسم کا تناؤ پیدا ہوتا ہے پھر وہ بدن کے دوسرے حصوں اور آخر میں پیٹ اور ٹانگوں تک پھیل جاتا ہے تب کہیں جا کر مصلوب کی موت واقع ہوتی ہے (12)

گویا اس عمل میں یقینی طور پر ایک دن سے زیادہ وقت لگتا ہے اور ان شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک جوان العمر اور مضبوط جسم کا مالک شخص تین چار گھنٹے میں صلیب پر ہرگز نہیں مرسکتا مشاہدہ اس خیال کی تائید نہیں کرتا بلکہ اسے سختی سے رد کردیتا ہے۔

قدیم ترین شہادت

مندرجہ بالا شہادتوں کے علاوہ اس سلسلے میں ایک قدیم ترین شہادت دستیاب ہوگئی ہے۔ یہ ایک دستاویز ہے' ایک طویل خط ہے جو واقعہ صلیب کے سات سال کے بعد جناب مسیحؑ کے ایک عقیدت مند نے اپنے ایک ہم مسلک بھائی کو اسکندریہ (مصر) بھیجا تھا خط لاطینی زبان میں تھا جو اسکندریہ کے ایک قدیم مکان سے ایک صدی قبل دستیاب ہوا تھا۔ اس کا انگریزی ترجمہ امریکہ میں پہلی بار ۱۸۷۳ء میں شائع کیا گیا تھا۔ اس کی اشاعت کے ساتھ ہی مسیحی حلقوں میں سخت طوفان برپا ہوگیا اور مطبوعہ خط کی ساری کاپیاں تلاش کر کے ضائع کروا دی گئیں۔ اس کا دوسرا ایڈیشن جو کتابی صورت میں تھا ۱۹۰۷ء میں امریکہ کے شہر شکاگو سے شائع ہوا اس وقت وہی ہمارے پیش نظر ہے۔

کتاب کا مصنف جو اس واقعے کا چشم دید گواہ ہے اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یوسف ارمیتہ اور حکیم نیکدیمس نے (صلیب سے اتارے جانے کے بعد) یسوع کے جسم کا معائنہ کیا۔ نیکدیمس بہت حیران تھا۔ وہ یوسف کو ایک طرف لے گیا اور اس سے کہا کہ اللہ کی قدرتوں کا جتنا مجھے علم اور ان پر یقین ہے اور جتنا حیات انسانی کے رازوں سے میں واقف ہوں اتنا ہی مجھے اس حقیقت کا یقین ہے کہ یسوع کو بچالینا ممکن ہے۔" (13)

اس خط سے دو امور ثابت ہوگئے ایک یہ کہ حضرت مسیحؑ کو صلیب پر ضرور چڑھایا گیا دوسرا یہ کہ صلیب سے اترنے کے بعد حضرت مسیحؑ نہ صرف زندہ تھے بلکہ آپؑ کی جسمانی حالت اتنی نازک نہیں تھی کہ علاج معالجے سے آپؑ کو بچایا نہ جاسکتا۔ اس دور کے ایک ماہر فن اور حاذق طبیب حکیم نیکدیمس نے جو موقع پر موجود تھا آپؑ کا طبی معائنہ کیا اور پھر یہ رائے دی کہ "یسوع کو بچانا ممکن ہے" اور تاریخ شہادت دیتی ہے کہ اس طبیب کے علاج سے جناب مسیحؑ صحت یاب ہوگئے پھر یروشلم سے ہجرت کرگئے۔

ملکہ برطانیہ کے معالج کی رائے

حال ہی میں ایک اور شہادت اس بارے میں منظر عام پر آئی ہے' شہادت بھی ایک مسیحی کی ہے' مسیحی بھی بہت بڑا ڈاکٹر اور ملکہ برطانیہ کا شاہی معالج ہے چنانچہ انگلستان کے تمام قابل ذکر اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ "ملکہ برطانیہ کے سابق معالج ڈاکٹر ٹریور لائیڈ ڈیوکس (Dr. Trever LLoyd Davics) نے انکشاف کیا ہے کہ یسوع اس وقت زندہ تھے جب انہیں صلیب سے اتارا گیا تھا' وہ محض بے ہوش ہوئے تھے۔ ڈاکٹر موصوف نے کہا کہ شہادتیں ظاہر کرتی ہیں کہ یسوع چھ گھنٹے صلیب پر رہے جبکہ موت صلیب پر چڑھائے جانے کے تین سے چار دن بعد واقع ہوتی تھی۔ یسوع کی حالت بالکل اس طرح تھی جیسے ایک بے ہوش شخص کی ہوتی ہے۔ ٹھنڈی جگہ پر لٹائے جانے اور آرام پہنچنے سے وہ ہوش میں آگئے تھے' ڈاکٹر ڈیوکس نے کہا کہ ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ جب وہ زخموں سے صحت یاب ہوگئے تھے تو انہوں نے دنیا میں طویل زندگی نہ گزاری ہو اور وہ برس ہا برس زندہ نہ رہے ہوں۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر لائیڈ ڈیوکس ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۱ء تک ملکہ برطانیہ کے آنریری معالج رہ چکے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف نے اپنا یہ متنازعہ نظریہ ایک طبی رسالے کے ذریعے پیش کیا ہے لیکن کلیسیا کے رہنماؤں نے اس سنسنی خیز انکشاف پر سخت لے دے کی ہے۔ آکسفورڈ کے بشپ کے ترجمان نے کہا کہ یہ ایسا انکشاف ہے کہ اس سے قبل بھی ہم اس قسم کی باتیں سن چکے ہیں لیکن اب اسے طبی نقطہ نظر سے جانچا اور پرکھا گیا ہے جسے درست قرار نہیں دیا جاسکتا ہے یہ کہنا کہ یسوع کو (آسمان پر) اٹھایا نہیں گیا تھا صرف بائبل کے مندرجات کو غلط انداز میں پیش کرنے کے مترادف ہے۔

جبکہ ڈاکٹر لائیڈ ڈیوکس نے کہا ہے کہ اب مسیحیوں کو یسوع کی موت کے بارے میں وہ حقیقت تسلیم کرلینی چاہئے جس کے ساتھ استدلال اور حقائق ہیں۔ ڈاکٹر ڈیوکس اور ان کی بیوی مارگریٹ نے جو مذہبی علوم سے آراستہ ہیں یسوع کی اس کیفیت کا بھی جائزہ پیش کیا ہے جو صلیب پر چڑھائے جانے کے بعد ان پر وارد ہوئی تھی۔ یہ جائزہ "رائل کالج آف فزیشنز" کے جریدے میں شائع ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ صلیب پر چڑھائے جانے

کے بعد یسوعؑ شدید ذہنی صدمے سے دو چار ہوئے تھے اور بلڈ پریشر گر جانے کی وجہ سے ان کے ہواس نے جواب دے دیا تھا کیونکہ دماغ کی طرف خون کی روانی قریباً ختم ہو گئی تھی ان کے اس جسمانی تغیر اور بے جان سی کیفیت کو غلطی سے ان کی موت سمجھ لیا گیا اور صلیب دینے والوں نے انہیں مردہ یقین کر لیا حالانکہ وہ ابھی زندہ تھے اگرچہ ان کے دل کی دھڑکن اور سانس لینے کا عمل غیر محسوس تھا (14)

یعنی محسوس نہیں ہوتا تھا اور وہ بظاہر مردہ نظر آتے تھے۔ گویا حقائق و شواہد اور طبی تجزیے نے اب اس خیال کو علمی لحاظ سے بھی ہمیشہ کے لئے مسترد کر دیا کہ جناب مسیحؑ صلیب پر فوت ہو گئے تھے یا انہیں آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا بلکہ ایک بہت بڑے فزیشن نے جو خود بھی مسیحی ہے اس حقیقت کا اظہار کر دیا کہ صلیبی زخموں سے صحتیاب ہو کر جناب مسیحؑ نے دنیا میں طویل زندگی گزاری اور برس ہا برس زندہ رہے۔ آئندہ صفحات میں انشاء اللہ ہم جناب مسیحؑ کی صلیب کے بعد کی زندگی سے تعلق رکھنے والے واقعات کا سراغ لگانے اور حیات مسیحؑ کی گم شدہ کڑیاں تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔

حوالہ جات

(1) متی باب ۲۷ آیت ۴۵ (2) متی باب ۲۷ آیت ۵۱ (3) مرقس باب ۱۵ آیت ۴۲
(4) یوحنا باب ۱۹ آیت ۳۱

(5) "JESUS LIVED IN INDIA" BY HOLGER KERSTEN: P.147 (6) یوحنا باب ۱۹ آیت ۳۳ (7) THE LIFE OF JESUS BY ERNES RENON, THINKER'S LIBRARY EDITION: P.211 (8) THE PASS OVER PLOT BONTAM BOKS BY DR. HOUGH J.SCHON FIELD:P.155 (9) K.P.KESAVA MENON: YESUDEVAN, THE MATHUR BHUMI PRINTING AND PUBLISHING CO. CALICUT, P.386 (10) ON THE PHYSECAL CAUSE OF DEATH OF CHRIST: P.55, BY WILLIAM STROUD (II) THE LIFE OF CHRIST VOL: II P.328, BY WILLIAM HANNA (12) THE LIFE OF JESUS, PANTHER HISTORY: P.401 BY DR. MARCELL CRAVARI (13) CRUCI FIXION BY AN EYE WITNESS:P.67 (14) JESUS DID NOT DIE ON CROSS, "TO DAY" LONDON, 27-04-1991

مقدس چادر

فوٹو گرافر حیرت زدہ تھا کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے کیونکہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس نے جس چادر کی تصویر اتاری ہے اس میں حضرت مسیحؑ کا عکس چھپا ہوا تھا جو اب کیمرے کی پلیٹ پر منتقل ہو گیا تھا اور وہ اپنے خداوند کو اپنے سامنے دیکھ رہا تھا ۔۔۔ اس کے ہاتھ ہیبت کی وجہ سے لرز رہے تھے۔

ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جن میں دنیا بھر سے آئے ہوئے سینکڑوں اخباری نمائندے بھی شامل تھے۔ آج دنیا کی مذہبی تاریخ کا بہت بڑا اور انقلاب آفریں اعلان ہونے والا تھا۔ یہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۸ء کا دن تھا اور اٹلی کے شہر تورین (Turin) کا شاہی گرجا آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور ایک پہر دن چڑھے یعنی ٹھیک دس بجے پاپائے اعظم (پوپ) کے نمائندے کارڈینل بلسٹر نے اعلان کیا کہ:۔

"سائنس دانوں کے تجزیے کی رو سے یہ چادر ۹۵ فی صد یقین کی حد تک ۱۲۶۰ء اور ۱۳۹۰ء کی درمیانی مدت میں تیار کی گئی۔"

آپ کو معلوم ہے کہ یہ کیسی چادر ہے؟ اور اس کی تاریخی و مذہبی حیثیت کیا ہے؟ عام مسیحی روایت کے مطابق یہ چادر وہ ہے جس میں صلیب سے اتارنے کے بعد حضرت مسیحؑ کو لپیٹا گیا تھا اور پھر عارضی قبر میں لٹا دیا گیا تھا۔ آج کے اس اعلان سے اس چادر کی مذہبی حیثیت مجروح ہو گئی اور جو لوگ سائنسی علوم اور ان کے تمام نتائج پر سو فی صد یقین رکھتے ہیں ان کے اعتقادات کی عمارت زمین بوس ہو گئی کیونکہ

سائنس دانوں کی تحقیق کے مطابق یہ چادر آج سے قریباً چھ صدیاں قبل تیار کی گئی تھی جبکہ حضرت مسیحؑ کا واقعہ صلیب قریباً دو ہزار سال قبل پیش آیا تھا۔ اگر سائنسی تجزیے کی رو سے اس چادر کی عمر بھی دو ہزار سال ثابت ہوتی تو اسے کفن مسیحؑ قرار دیا جا سکتا تھا۔

سوال یہ ہے کہ کیا اس سائنسی تجزیے پر مکمل اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ کیا اس میں غلطی کا امکان نہیں ہے؟ کیا اس چادر کے بارے میں اس تجزیے کے علاوہ کچھ اور شواہد بھی ہیں؟ اگر ہیں تو ان کی تاریخی حیثیت کیا ہے ان میں کہاں تک معقولیت ہے؟ آیئے ان سوالات کے جوابات تلاش کریں۔

مسیحؑ چادر میں

اس میں تو کوئی شک نہیں اور انجیل شہادت دیتی ہے کہ جب حضرت مسیحؑ کو صلیب پر چڑھایا گیا تو چند گھنٹے گزرنے کے بعد آپؑ کا ایک عقیدتمند اور شہر ارمیتہ کا رئیس یوسف گورنر پیلاطوس کے پاس گیا اور اس سے جناب مسیحؑ کی "نعش" حاصل کرنے کی اجازت لے لی۔ "نعش" حاصل کرنے کے بعد اسے ایک سوتی چادر میں لپیٹا گیا۔ یہ چادر بھی ارمیتہ کا رئیس یوسف ہی لایا تھا۔ اسی اثنا میں حضرت مسیحؑ کا شاگرد خاص اور اس عہد کا ماہر فن طبیب حکیم نیکدیمس "مر" اور "عود" لایا یہ دونوں چیزیں کچھ اور ادویہ کے ساتھ ملا کر جنہیں انجیل میں "خوشبوؤں" کا نام دیا گیا ہے حضرت مسیحؑ کے جسم پر مل دی گئیں دوسری روایت کے مطابق چادر پر مل دی گئیں اس کے بعد آپؑ کو اس کمرہ نما قبر میں لٹا دیا گیا جو رئیس یوسف نے اپنے باغ میں تیار کروائی تھی۔ (1)

قبر کا منہ ایک پتھر سے بند کر دیا گیا اور ہوا کے لئے تھوڑی سی جگہ چھوڑ دی گئی۔ (2)

تیسرے روز یعنی اتوار کو حضرت مسیحؑ کی ایک خاتون حواری مریم مگدلینی دوسری دو خواتین کے ساتھ جب قبر پر آئیں تو دیکھا کہ پتھر قبر کے منہ پر نہیں ہے پھر انہوں نے

اندر جھانک کر دیکھا تو حضرت مسیحؑ کا جسم بھی قبر میں موجود نہیں تھا پس وہ تینوں شمعون پطرس اور ایک دوسرے شخص کے پاس دوڑی ہوئی گئیں جسے جناب مسیحؑ عزیز رکھتے تھے اور ان سے کہا کہ:

"خداوند کو قبر سے نکال لے گئے اور ہمیں معلوم نہیں کہ اسے کہاں رکھ دیا ○ پس پطرس اور دوسرا شاگرد نکل کر قبر کی طرف چلے اور دونوں ساتھ ساتھ دوڑے مگر وہ دوسرا شاگرد پطرس سے آگے بڑھ کر قبر پر پہلے پہنچا ○ اس نے جھک کر نظر کی اور سوتی کپڑے پڑے ہوئے دیکھے مگر اندر نہ گیا ○ شمعون پطرس اس کے پیچھے پیچھے پہنچا اور اس نے قبر کے اندر جا کر دیکھا کہ سوتی کپڑے پڑے ہیں اور وہ رومال جو اس کے سر سے بندھا ہوا تھا سوتی کپڑوں کے ساتھ نہیں بلکہ لپٹا ہوا الگ پڑا ہے۔" (3)

انجیل کے ان دونوں حوالوں سے تین باتیں ثابت ہو گئیں (۱) حضرت مسیحؑ کے جسم کو عارضی قبر میں اتارنے سے قبل اسے کفنانے کے لئے سوتی کپڑے کی چادر لائی گئی تھی (۲) چادر پر خوشبودار اشیاء کا محلول یا سفوف لگایا گیا تھا (۳) تیسرے روز جب آپؑ کے شاگرد اس قبر میں داخل ہوئے جس میں آپؑ کو عارضی طور پر رکھا گیا تھا تو آپؑ کا جسم غائب تھا البتہ وہ سوتی کپڑے پڑے ہوئے تھے جن میں آپؑ کو لپیٹا گیا تھا۔ یہ دو کپڑے تھے ایک رومال جو سر پر باندھا گیا تھا اور دوسرا کپڑا ایک چادر تھی جس میں باقی جسم لپیٹا گیا تھا۔ یہ قدرتی بات ہے کہ جب شمعون پطرس اور مریم مگدلینی کے ذریعے بعض دوسرے حواریوں کو حضرت مسیحؑ کا جسم غائب ہو جانے کی اطلاع ملی ہو گی تو وہ افتاں و خیزاں آپؑ کی عارضی قبر پر پہنچے ہوں گے اور ان ہی میں سے کوئی حواری یا شاگرد رومال اور چادر اٹھا لے گئے ہوں گے اور انہیں ایک نادر و گراں قدر یادگار سمجھ کر محفوظ کر لیا ہو گا (کسی قدر تفصیل آگے چل کر بیان کی جائے گی) رومال جو بہت چھوٹا تھا ضائع ہو گیا مگر چادر جو قریباً پندرہ فٹ (۱۴ فٹ ۳ انچ) لمبی اور قریباً ساڑھے تین فٹ (۳ فٹ ۷ انچ) چوڑی تھی محفوظ رہی۔ چونکہ اس چادر کے ذریعے سے ایک بہت بڑی صداقت آشکار ہونی تھی اور وہ بہت بڑی امانت کی امین تھی اس لئے ایسے سامان پیدا ہو گئے کہ سینکڑوں انقلابات آنے کے باوجود وہ

چادر آج تک محفوظ ہے، اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اس چادر کی مسلسل تاریخ
محفوظ نہیں اور درمیان میں کئی صدیوں پر مشتمل ایسے وقفے آئے ہیں جب یہ چادر
نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اسی کے باوجود بھی اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ وہی
چادر ہے جس میں جناب مسیحؑ کو لپیٹ کر ان کی عارضی قبر میں رکھا گیا تھا تو یقیناً یہ
بہت بڑا معجزہ اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا عظیم الشان نشان ہو گا اور اب ایسے سامان
پیدا ہو رہے ہیں چنانچہ اس چادر کے بارے میں اب تک کئی ہزار مضامین لکھے جا چکے
ہیں، سینکڑوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور بعض مستقل ادارے قائم ہو چکے ہیں جو
اس چادر سے منسوب ہیں۔

چادر کی مختصر تاریخ

اس چادر کے بارے میں ایک بہت جامع اور مستند کتاب "The Turin Shroud"
ہے جس کے مصنف جان ولسن نامی ایک فاضل محقق ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ
چادر ابتدا میں جناب مسیحؑ کے خاندان کے قبضے میں رہی اس خاندان کا ایک فرد
جوڈے تھیڈن (Jude Thadden) یہ چادر ترکیہ کے جنوب مشرق میں واقع شہر ادیسا
(EDESSA) لے گیا اس کے بعد ۵۷ء میں یہ چادر غائب ہو گئی اور قریباً پانچ سو سال
تک غائب رہی۔ ۵۴۴ء میں یہ چادر پھر ظاہر ہوتی ہے، یہ وقت وہ ہے جب ایرانی
فوجیں ادیسہ نامی اس شہر پر حملہ کرتی ہیں۔ دشمن کی کثرت دیکھ کر ادیسہ کے حکمرانوں
کی ہدایت پر چادر کو فصیل شہر پر پھیلا دیا جاتا ہے۔ روایات اور اعتقاد کے مطابق اس
چادر کی برکت سے ادیسہ کو فتح حاصل ہوتی ہے ایرانی فوجیں شکست خوردہ ہو کر پسپا
ہو جاتی ہیں اس واقعے نے اس چادر کی تقدیس کے بارے میں بہت اضافہ کر دیا اور
جن لوگوں کو اس کے حقیقی ہونے میں شبہ تھا ان کے بھی شبہات دور ہو گئے۔
دسویں صدی عیسوی میں واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ چادر "ادیسہ" کے
اسلامی شہر میں موجود تھی لیکن مسلمانوں کے پاس نہیں تھی بلکہ ادیسہ کے مسیحیوں کی
تحویل میں تھی اور ان کے ایک مقدس گرجا میں محفوظ تھی چنانچہ جان ولسن کی تحقیق

کے مطابق چادر حاصل کرنے کے لئے بازنطینی عیسائی فوج نے ۹۴۴ء میں "ادیسہ" پر
حملہ کر دیا لیکن "ادیسہ" کے مسیحیوں نے چادر دینے سے انکار کر دیا مگر اسی دوران
میں کچھ مسلمان (جن کی تعداد دو سو کے قریب تھی) عیسائی فوج کے ہاتھ لگ گئے
جنہیں اس نے یرغمال بنا لیا۔ آخر "ادیسہ" کی ترک حکومت نے فیصلہ کیا کہ
مسلمانوں کو رہا کروانے اور ان کی جانیں بچانے کی خاطر یہ چادر حملہ آور فوج کے
حوالے کر دینی چاہئے، چنانچہ "ادیسہ" کے مسیحیوں سے درخواست کی گئی کہ وہ یہ چادر
حملہ آور فوج کے سپرد کر دیں اس طرح یہ متبرک چادر قسطنطنیہ کے عیسائی حکمرانوں
کے پاس پہنچ گئی۔ ۱۲۰۴ء میں فرانس کی فوجوں نے قسطنطنیہ پر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں
بڑی سخت خوں ریزی اور لوٹ مار ہوئی۔ اس لوٹ مار سے یہ چادر بھی محفوظ نہ رہی
اور نوابان فرانس اسے لوٹ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ حملہ آور فوج کے ایک جرنیل
رابرٹ ڈی قلاری نے شہادت دی کہ جب اس نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا تو بلاچرنائی
(Blacherni) کی "خانقاہ مریم" میں اس نے یہ چادر دیکھی تھی۔ جنرل کے بقول ہر
جمعہ کو اس کی نمائش کی جاتی تھی۔ یہاں تک تو کوئی بات تعجب انگیز نہیں، تعجب اس
وقت ہوتا ہے اور انسان حیرت زدہ رہ جاتا ہے جب جنرل یہ گواہی
دیتا ہے کہ اس چادر پر ہمارے خداوند یسوع مسیح کی تصویر بہت
نمایاں نظر آتی تھی۔ قریباً ڈیڑھ سو سال کے بعد
۱۳۵۴ء میں یہ چادر مشرقی فرانس کے شہر لیری (Lirey) سے ظاہر ہوئی جہاں فرانس
کے ایک نواب جیفری ڈی چیرنی (Jeoffrey De Charny) نے اسے شہر کے کالج
میں واقع گرجا میں محفوظ کر دیا تھا۔ چند دہائیوں کے بعد جیفری کی پوتی مارگیو رائٹ
ڈی لاروچ (Marguerite De Laroche) نے یہ چادر سوائے (Sovoe) کے
نوابین کو بطور تحفہ دے دی۔ اب یہ مقدس چادر شہر چیمبری (Chambery) کے گرجا
میں محفوظ تھی یہ گرجا شہر سوائے (Sovoe) کے ڈیوک کے محل میں واقع تھا۔ ۱۵۳۲ء
میں یہاں آگ بھڑک اٹھی اور یہ گرجا بری طرح تباہ ہو گیا البتہ یہ چادر جو چاندی کے
صندوق میں بند تھی بچ گئی مگر تباہی سے مکمل طور پر محفوظ نہ رہ نہ سکی۔ آگ کی

شدت سے صندوق کی چاندی پگھل کر چادر پر گری اور اس کے بعض حصے جل گئے مگر خداوند تعالیٰ کی قدرت کہ وہ حصہ مکمل طور پر محفوظ رہا جس پر حضرت مسیحؑ کی تصویر اتر آئی تھی۔ اسی اثناء میں ایک مسیحی فدائی نے جان پر کھیل کر اس صندوق کو جلتے ہوئے گرجا سے نکال لیا اسے پانی میں ڈال دیا گیا (غالباً کسی حوض میں) اس طرح آگ کی مانند گرم صندوق کی حدت ختم ہو گئی اور چادر ضائع ہونے سے بچ گئی۔ اس کے بعد "ننوں" کی ایک جماعت نے اس چادر کے جلے ہوئے حصوں کو رفو کیا۔ اب اس مقدس چادر کے لئے جسے کفن کی چادر بھی کہتے ہیں ایک عظیم الشان گرجا اٹلی کے شہر تورین (Turin) میں تعمیر کیا گیا ۱۶۹۴ء میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی اس گرجا کو (Chaple Of Sindone) کے نام سے موسوم کیا گیا یعنی مقدس کفن کا گرجا اور اسی سال یعنی ۱۶۹۴ء میں یہ چادر اس نئے گرجا میں منتقل کر دی گئی جو چار فٹ لمبے چوبی صندوق میں گذشتہ تین صدیوں سے محفوظ ہے صندوق کو چاندی کی شیٹوں سے مزین کیا گیا ہے۔ اس چادر کا مالک اٹلی کا شاہی خاندان تھا جس کے آخری معزول بادشاہ امبر ٹو ثانی (Umber To II) نے وصیت کر دی تھی کہ ان کے انتقال کے بعد یہ مقدس چادر پاپائے اعظم (پوپ) کے سپرد کر دی جائے وہی اس کی حفاظت و نگرانی کریں گے چنانچہ کم و بیش ایک صدی سے پاپائے روم اس چادر کے کسٹوڈین ہیں ان کی اجازت کے بغیر کوئی شخص اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔

یہ ہے اس چادر کی مختصر سی تاریخ جو گذشتہ کئی دہائیوں سے کچھ زیادہ ہی بحث و نزاع کا موضوع بنی ہوئی ہے اور جسے بعض حلقوں کی طرف سے مشتبہ قرار دینے کی شدومد سے کوشش کی جا رہی ہے۔ اگر یہ صرف چادر ہوتی یعنی سادہ سی چادر تو شائد اس کے بارے میں اس قدر چھان بین نہ کی جاتی مگر اس چادر پر حضرت مسیحؑ کے چہرہ مبارک اور ان کے جسم کا عکس مرتسم ہے جو اس امر کا بین ثبوت ہے کہ اس چادر میں حضرت مسیحؑ کو زندہ حالت میں لپیٹا گیا تھا۔ اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کو زندہ حالت میں صلیب سے اتار لیا گیا تھا تو موجودہ مسیحیت کی وہ ساری عمارت زمیں بوس ہو جاتی ہے جس کی بنیاد پولوس نے کفارہ پر رکھی تھی اس لئے

مسیحیوں کا وہ طبقہ جس کی مذہب پر اجارہ داری ہے مدتوں سے اس چادر کو جعلی قرار دینے پر تلا ہوا ہے۔

چادر پر شبیہ مسیحؑ؟

سب سے بڑا اعتراض اس چادر پر یہی کیا گیا کہ کپڑے پر کسی انسان یا منظر کی تصویر خود بخود کیسے منعکس ہو سکتی ہے جب تک کہ اسے پینٹ نہ کیا جائے۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ جعلی کارروائی ہے اور کسی ماہر فن مصور نے برش اور رنگوں کی مدد سے یہ تصویر بنا دی۔ اس تصویر کی مختصر رودادیہ بیان کی جاتی ہے کہ روایت کے مطابق ہر ۳۳ سال کے بعد اس چادر کی نمائش کی جاتی تھی (۳۳ سال کے بعد اس لئے کہ واقعہ صلیب کے وقت حضرت مسیحؑ کی عمر ۳۳ سال تھی) اس کے علاوہ بعض خاص مواقع پر بھی اس کی زیارت کروائی جاتی تھی ۱۸۹۵ء میں جب یہ چادر اٹلی کے معزول حکمران شاہ امبر ٹو ثانی (Umber To II) کے قبضے میں تھی تو بادشاہ کی اجازت سے اس کا دیدار عام کروایا گیا اور دور و نزدیک سے ہزاروں مسیحی اس کی زیارت کرنے کے لئے اٹلی آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فوٹو گرافی کا فن اور کیمرہ نیا نیا ایجاد ہوا تھا چنانچہ اٹلی کے ایک شوقیہ فوٹو گرافر مسٹر سیکنڈ وپیا (Secondopia) نے جو پیشے کے لحاظ سے وکیل تھے اس چادر کی تصویر اتار لی اس وقت تک فوٹو گرافی ابتدائی مرحلے میں تھی اور تصویر اتارنے کے لئے بکس نما کیمرے استعمال ہوتے تھے۔ سیلولائٹ کی فلم بھی ایجاد نہیں ہوئی تھی بلکہ شیشے کی پلیٹ سے یہ کام لیا جاتا تھا۔ فوٹو گرافر سیکنڈوپیا تصویر اتار کر جب ڈارک روم میں گیا اور اس پلیٹ کو کیمیائی محلول میں ڈال کر نکالا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ اس پلیٹ پر حضرت مسیحؑ کی سیدھی تصویر ابھر آئی تھی جسے مثبت (Positive) کہتے ہیں۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا بلکہ تصویر کشی کی دنیا کا حیرت انگیز اور ناممکن الوقوع واقعہ تھا جواب وقوع میں آ چکا تھا۔

فوٹو گرافی کے فن کا مبتدی بھی جانتا ہے کہ جب کسی انسان، حیوان یا کسی منظر کی تصویر اتاری جاتی ہے تو کیمرے کی فلم پر اس کا ہمیشہ الٹا عکس آتا ہے جسے نیگیٹو

(Negative) کہتے ہیں۔ اس نیگیٹو سے بعد میں سیدھی تصویر (مثبت یا پازیٹو Positive) بنتی ہے لیکن یہاں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو ناممکن ہے یعنی الٹی تصویر (نیگیٹو) بننے کی بجائے سیدھی تصویر بن گئی یعنی پازیٹو بن گیا۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ جس کپڑے سے تصویر اتاری گئی تھی اس پر حضرت مسیحؑ کی الٹی تصویر یعنی نیگیٹو پہلے سے موجود ہوتا۔ چنانچہ اس کپڑے کی سینکڑوں بلکہ ہزاروں تصاویر شائع ہو چکی ہیں اور سب جانتے ہیں کہ یہ تصویریں واقعی الٹی ہیں یعنی نیگیٹو ہیں۔ جب یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی اور اس کے ساتھ یہ تصویر شائع ہوئی تو سارے یورپ اور پھر امریکہ میں تہلکہ مچ گیا، ہر شخص سوچتا تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ آخر طویل غور و فکر اور اس سارے معاملے کا تجزیہ کرنے کے بعد اصل حقیقت سامنے آئی، جس کی تفصیل یہ ہے۔

انجیل کہتی ہے کہ جب حضرت مسیحؑ کو صلیب سے اتارا گیا تو انہیں ایک چادر میں لپیٹ دیا گیا۔ چادر میں لپیٹنے سے قبل "مر" اور "ایلوا" کے محلول کا لیپ کیا گیا۔

(4)

یہی محلول شدہ چادر فوٹو گرافی کی پلیٹ بن گئی چنانچہ تورین شراوڈ (Turin Shroud) کی برطانوی سوسائٹی کے ممبر مسٹر روڈنی ہورے (Hoare Rodney) نے اس چادر پر نہایت سنجیدہ اور گہری تحقیق کرنے کے بعد یہ رائے دی ہے کہ جب حضرت مسیحؑ کو اس چادر میں لپیٹا گیا جس پر "مر" اور "ایلوا" کے محلول کا لیپ کیا گیا تھا اور انہیں قبر نما غار میں رکھا گیا تو ان کے جسم سے جو پسینہ اور بخارات خارج ہوئے وہ اس محلول شدہ چادر میں جذب ہو گئے، ان بخارات نے چادر کے ان تمام حصوں کو چھوا جو حضرت مسیحؑ کے جسم کو ڈھانپے ہوئے تھے اس طرح ان کے جسم کے سارے خدوخال اس چادر پر اتر آئے مگر کہیں گہرے اور کہیں مدہم۔

اس نظریے کو اس وقت زیادہ تقویت ملتی ہے جب ہم علم الابدان کے بہت بڑے ماہر پروفیسر پال وگنان (Prof : Paul Vignon) کے تجربات پر غور کرتے ہیں، پروفیسر وگنان نے تجربے سے ثابت کیا ہے کہ جب پسینے میں شرابور جسم کو ایسے کپڑے میں لپیٹ دیا جائے جسے ہلکے تیل اور "ایلوا" کے محلول میں ڈبویا جا چکا ہو تو وہ اس قسم کا رنگ پیدا کرے گا جیسا اس متبرک چادر پر نظر آتا ہے کیونکہ پسینے میں جو اجزاء موجود ہوں گے ان کے کپڑے پر بکھرنے سے ایک قسم کا بے رنگ دھواں یا بھاپ پیدا ہو گی، یہ بھاپ چادر کی بُنتی کے خانوں میں ایک قسم کا رنگ پیدا کرنے کا سبب بنے گی۔ رنگ پیدا کرنے کا یہ عمل اس جگہ زیادہ واضح ہو گا جہاں کپڑے اور جسم میں فاصلہ بہت کم یا نہ ہونے کے برابر ہو گا۔ اور جس جگہ چادر اور بدن میں فاصلہ زیادہ ہو گا وہاں رنگ ہلکا اور مدہم ہو گا اس سے یہ عقدہ بھی حل ہو گیا کہ چادر پر حضرت مسیحؑ کے جسم اور چہرے کے بعض حصوں کے رنگ مدھم اور بعض کے نمایاں اور تیز کیوں ہیں۔ (5)

پروفیسر وگنان نے عملی تجربہ کرنے کے بعد اپنی تھیوری کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت مسیحؑ کی شبیہ کے خدوخال اس پسینے کی وجہ سے پیدا ہوئے جو آپؑ کے جسم سے خارج ہو رہا تھا اور جس میں یورک ایسڈ اور سلفر شامل تھا۔ ان دونوں قدرتی کیمیائی مادوں کے امتزاج نے اس چادر پر موجود "مر" اور "ایلوا" کے کیمیائی مادوں سے مل کر ایسا عمل کیا جس کے نتیجے میں حضرت مسیحؑ کے چہرے اور جسم کے نقوش چادر پر مرتسم ہو گئے۔

۴۵ سیکنڈ میں تصویر؟

گویا پروفیسر وگنان کے تجربے نے ثابت کر دیا کہ اگر جسم کو بشرطیکہ وہ زندہ ہو ایسے کپڑے میں لپیٹ دیا جائے جسے "مر" اور "ایلوا" کے محلول میں تر کیا جا چکا ہو تو آج بھی اس کپڑے پر جسم اور چہرے کے خدوخال کے نقوش منعکس ہو جائیں گے اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ "مر" اور ایلوا" کے محلول میں یہ خاصیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر کسی کپڑے یا جسم پر اس کا لیپ کر دیا جائے اور پھر اس کپڑے میں کسی ایسے جسم کو لپیٹ دیا جائے جس سے پسینہ اور نمک خارج ہو رہا ہو تو صرف ۴۵ سیکنڈ کی قلیل مدت میں وہ کپڑا اس جسم کے سارے اعضاء اور خدوخال کے نقوش اتار

لے گا۔ (6)

یعنی محلول میں تر کیا ہوا کپڑا فوٹو گرافی کی پلیٹ (فلم) کی حیثیت اختیار کر لے گا۔ سب جانتے ہیں کہ انجیل کے بیان کے مطابق حضرت مسیحؑ کو جس چادر میں لپیٹا گیا تھا اس پر "مر" اور عود (ایلوا) کے محلول ہی کا لیپ کیا گیا تھا۔ (7)

یہ بھی قرین عقل حقیقت ہے کہ صلیبی زخموں کی وجہ سے حضرت مسیحؑ کو شدید بخار تھا اور بخار میں پسینہ آنا ایک قدرتی امر ہے پس جب حضرت مسیحؑ کو "مر" اور "ایلوا" کے محلول میں تر کی ہوئی چادر میں لپیٹ کر غار نما قبر میں لٹا دیا گیا اور قبر کا منہ ایک بڑے پتھر سے بند کر دیا گیا تو آپؑ کے جسم سے خارج ہونے والے پسینے نے جس میں لازمی طور پر نمک بھی تھا اس چادر پر کیمیائی عمل کیا جس میں حضرت مسیحؑ لپٹے ہوئے تھے اس طرح چادر پر آپؑ کی شبیہ اتر آئی اور جسم کے وہ سارے اعضاء بھی منقش ہو گئے جن سے چادر لمس کر رہی تھی اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔ اچنبھا تو اس وقت ہوتا جب چادر پر آپؑ کے چہرہ اور اعضائے جسم کے خدوخال منعکس نہ ہوتے کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی عمل ہوتا۔

اس چادر نے اس متنازعہ مسئلے کا ہمیشہ کے لئے فیصلہ کر دیا کہ جس وقت حضرت مسیحؑ کو صلیب سے اتارا گیا اس وقت آپؑ زندہ تھے یا مردہ؟ کیونکہ:-

(۱) اگر حضرت مسیحؑ صلیب سے اترنے کے بعد مردہ ہوتے تو کفن کی اس چادر پر ان کی شبیہ مبارک اور اعضائے جسم کے نقوش کبھی مرتسم نہ ہوتے اس لئے کہ "ایلوا" میں بھیگی ہوئی چادر پر تصویر اس وقت تک مرتسم نہیں ہو سکتی جب تک جسم سے بخارات اور پسینہ خارج نہ ہو رہا ہو اور بخارات اور پسینہ مردہ جسم سے خارج نہیں ہوا کرتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ جس وقت حضرت مسیحؑ کو اس چادر میں لپیٹا گیا اس وقت شدید غشی یا سکتے کی وجہ سے آپؑ پر مردہ ہونے کا گمان گزرتا تھا مگر درحقیقت آپؑ زندہ تھے اور آپؑ کے جسم سے بخارات اور پسینہ دونوں چیزیں خارج ہو رہی تھیں۔

(۲) چادر پر خون کے دھبوں کا موجود ہونا بھی ثابت کرتا ہے کہ جس وقت حضرت

مسیحؑ کو صلیب سے اتارا گیا اس وقت آپؑ زندہ تھے کیونکہ خون زندہ جسم سے نکلا کرتا ہے مردہ جسم سے نہیں۔ اس چادر پر خون کے دو قسم کے نشانات ہیں ایک مدھم نشانات اور دوسرے گہرے نشانات۔ مدھم نشانات اس خون کے ہیں جو حضرت مسیحؑ کو صلیب پر چڑھانے کے فوراً بعد بہا تھا اور پھر خشک ہو گیا تھا جیسے سر اور کلائیوں سے بہنے والا خون۔ سر سے خون اس وقت بہا تھا جب آپؑ کو نوکیلے کانٹوں والا تاج پہنایا گیا تھا جس نے سر کی کھال میں پیوست ہو کر زخم پیدا کر دیے تھے ان زخموں سے خون بہہ کر سر کے بالوں میں جم گیا تھا اور جب حضرت مسیحؑ کو چادر میں لپیٹ کر قبر نما غار میں رکھا گیا تو پسینہ آنے کی وجہ سے اس خشک اور منجمد خون کے دھبے چادر پر آ گئے چونکہ یہ دھبے تازہ خون کے نہیں بلکہ جمے ہوئے خون کے ہیں اس لئے مقابلتاً مدھم ہیں۔ دوسرے مدھم دھبے اس خون کے ہیں جو حضرت مسیحؑ کے ہاتھوں سے اس وقت بہا تھا جب آپؑ کو صلیب پر چڑھانے کے بعد آپؑ کی کلائیوں میں کیلیں ٹھونکی گئی تھیں۔ تین چار گھنٹے کی مدت میں یہ خون بھی خشک ہو کر جم گیا تھا اور اس کے دھبے بھی کفن کی چادر پر آ گئے تھے یہ دھبے بھی سر سے بہنے والے خون کے دھبوں کی طرح مدھم ہیں کیونکہ خشک شدہ خون کے ہیں۔

اس چادر پر دوسرے دھبے تازہ خون کے ہیں اور یہ گہرے ہیں۔ یہ وہ خون ہے جو حضرت مسیحؑ کے جسم سے اس وقت بہا تھا جب آپؑ کو صلیب سے اتارا گیا تھا جس وقت آپؑ کے ہاتھوں سے کیلیں نکالی گئیں تو یکدم کلائیوں سے خون جاری ہو گیا چونکہ یہ خون تازہ تھا اس لئے کفن کی چادر پر اس کی لکیریں اور دھبے مقابلتاً گہرے آئے۔ اسی طرح جب رومی سپاہی نے آپؑ کی پسلی میں نیزہ مارا تو اس سے بھی خون جاری ہوا، یہ خون بھی تازہ تھا اس لئے چادر پر اس کے دھبے بھی گہرے آئے۔

چادر پر شبہات

جب تک یہ چادر بہت حد تک پوشیدہ رہی اس وقت تک اس کے بارے میں کوئی نزاع پیدا نہیں ہوا لیکن جب منظر عام پر آئی تو اس کی تقدیس کو مجروح کرنے

والے بھی منظر عام پر آ گئے۔ یہ تھے کلیسیا کے مفاد پرست اجارہ دار جنہوں نے اس
چادر کے اصلی اور حقیقی ہونے کے بارے میں طرح طرح کے شبہات پیدا کیے۔ ان
میں سے بعض نے تو سرے سے اس حقیقت ہی کا انکار کر دیا کہ اس چادر میں حضرت
مسیحؑ کو لپیٹا گیا تھا۔ انہوں نے اس چادر کو جعلی قرار دیا اور حضرت مسیحؑ کی شبیہ کے
عکس کے بارے میں یہ موقف اختیار کیا کہ یہ تصویر کسی فنکار کی فنکارانہ چابکدستی کا
شاہکار ہے ورنہ حضرت مسیحؑ کو اس چادر میں کبھی نہیں لپیٹا گیا۔ دوسرا گروہ مذہب
کے ان اجارہ داروں کا تھا جو کھلی صداقتوں کا تو انکار نہیں کر سکے، انہوں نے یہ تو
تسلیم کر لیا کہ واقعی یہ وہی چادر ہے جس میں حضرت مسیحؑ کو لپیٹا گیا تھا مگر ساتھ ہی یہ
کمزور ترین موقف اختیار کیا کہ اس میں فوت شدہ مسیحؑ کو لپیٹا گیا تھا زندہ مسیحؑ کو
نہیں، چونکہ یہ لوگ پہلے سے ایک عقیدہ اختیار کر چکے تھے کہ جناب مسیحؑ صلیب پر
فوت ہو گئے تھے اس لئے اب ان کے سامنے سوائے اس کے اور کوئی راستہ باقی نہیں
رہا تھا کہ اس چادر میں لپیٹے جانے والے شخص کو مردہ قرار دیں مگر یہاں آ کر وہ بے
بس ہو گئے اور ایک ایسی گلی میں آ گئے جو سامنے سے بند تھی۔ ان سے سوال کیا جاتا
ہے کہ مردہ شخص کے جسم سے خون کیسے بہتا رہا جس کے داغ اس چادر پر موجود ہیں
پھر اس کی تصویر اس چادر پر کیسے اتر آئی کیونکہ "ایلوا" (عود) کے محلول میں بھیگا ہوا
کپڑا اس وقت تک کوئی عکس قبول نہیں کرتا جب تک اس میں لپیٹے جانے والے جسم
میں سے بخارات اور پسینہ خارج نہ ہو رہا ہو اور یہ دونوں چیزیں مردہ جسم سے خارج
نہیں ہو سکتیں۔ اس اعتراض سے بچنے کے لئے انہوں نے یہ کہانی گھڑی کہ یسوع
صلیب پر فوت ہو گیا تھا مگر تیسرے دن اپنی (غار نما) قبر میں وہ دوبارہ جی اٹھا تھا اس
لئے اس کے زخموں سے خون بہنے لگا تھا، اس کا بدن بخارات اور پسینہ خارج کرنے لگا
تھا۔ ظاہر ہے یہ ایک دیو مالائی داستان تو ہو سکتی ہے حقائق کی دنیا سے اس کا کوئی
تعلق نہیں۔ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے اس وقت سے آج تک ایسا نہیں ہوا کہ ایک
شخص حقیقی طور پر مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو گیا ہو۔ علم الابدان اور علم الحیات کی
رو سے بھی مردہ زندہ نہیں ہو سکتا اور نہ خداوند تعالیٰ نے کسی مذہب کی آسمانی کتاب

میں ایسا فرمایا ہے۔

خون کی لکیر

یہی وجہ ہے کہ خود روشن خیال اور معقولیت پسند مسیحی دانشوروں نے بھی اس
نظریئے کو مسترد کر دیا کہ حضرت مسیحؑ پہلے مردہ تھے، پھر جی اٹھے چنانچہ یورپ کے
ممتاز محقق اور دانشور مسٹر کرٹ برنا (Kert Berna) نے جو کفن مسیح کے بارے میں
دو تحقیقی اور عالمانہ کتابوں کے بھی مصنف ہیں، پاپائے اعظم (پوپ جان XX III) کو
ایک خط تحریر کیا۔ اس خط کا پس منظر یہ ہے کہ "مقدس کفن" کے بارے میں
تحقیقات کرنے کی غرض سے جرمنی میں ایک کمیٹی قائم کی گئی جو مختلف شعبوں سے
متعلق ماہرین پر مشتمل تھی اس کمیٹی نے طویل تحقیق کے بعد ۱۹۵۷ء میں اپنی تحقیقی
رپورٹ پیش کر دی۔ اس رپورٹ کی رو سے جس وقت حضرت مسیحؑ کو صلیب پر
چڑھایا گیا اس وقت قدرتی طور پر ان کے سر اور ہاتھ کو باقی حصہ جسم سے بلندی پر
ہونا چاہئے تھا اگر وہ مر چکے تھے تو ان کے سر اور ہاتھ سے خون کا ایک قطرہ بھی نہیں
بہنا چاہئے تھا کیونکہ مردہ انسان کا دل اس کے سر اور ہاتھ کی طرف خون نہیں پھینک
سکتا اور نہ اس چادر پر کوئی نشان آنا چاہئے تھا جس میں حضرت مسیحؑ کو لپیٹا گیا تھا جبکہ
اس چادر پر خون کے نشانات موجود ہیں۔ اگر حضرت مسیحؑ صلیب پر کچھ دیر کے لئے
فوت ہو گئے تھے تو ان کے جسم کا سارا خون نچلے حصے میں منجمد ہو گیا ہو گا اس
صورت میں ان کے جسم سے خون نہیں بہنا چاہئے تھا مگر مقدس چادر پر باریک سی
خون کی لکیر یہ ظاہر کرتی ہے کہ جب حضرت مسیحؑ کے داہنے ہاتھ سے کیل نکالی گئی تو
اس میں سے خون بہا اور اس نے داہنے ہاتھ کے نیچے والے حصۂ کفن پر لکیر نما نشان
بنا دیا ورنہ یہ نشان کبھی نہ پڑتا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جس وقت حضرت مسیحؑ کو
صلیب سے اتار کر اس چادر میں لپیٹا گیا تو ان کا دل حرکت کر رہا تھا۔

مسیحی دانشور کا خط

مسیحی دانشور اور محقق کرٹ برنا (Kert Berna) نے جو خود رومن کیتھولک ہیں

اس رپورٹ کے منظرعام پر آنے کے بعد پوپ جان کو لکھا کہ :-

" تقدس مآب !

دو سال گذرے کہ مقدس کفن پر تحقیقات کرنے والے جرمن ادارے نے اپنی رپورٹ آپ کے دفترِ مقدس اور عامتہ الناس کے مطالعہ کے لئے پیش کر دی تھی۔ اس ۲۴ - ماہ کی مدت میں جرمنی کی یونیورسٹیوں کے مختلف ماہروں نے محققانہ انکشافات کو رد کرنے کی ناکام کوشش کی اس کے باوجود انہیں اپنی شکست تسلیم کرنی پڑی انہوں نے ان حقائق کو درست تسلیم کرلیا ہے کہ مسیحی اور یہودی دونوں مذاہب کے ماننے والوں کے لئے یہ تحقیقاتی نتائج بہت اہمیت کے حامل ہیں اب اس امر میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا اور پوری طرح ثابت ہو گیا ہے کہ یہ وہی چادر ہے جس میں حضرت مسیحؑ کو صلیب سے اتارنے اور کانٹوں کا تاج الگ کرنے کے بعد لپیٹا گیا تھا اور کچھ وقت تک وہ اس میں لپٹے رہے۔ میڈیکل نقطہ نگاہ سے بھی ثابت ہو گیا ہے کہ جس جسم کو اس چادر میں لپیٹا گیا تھا وہ مردہ نہیں تھا کیونکہ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ مقدس کفن پر بہنے والے خون کے دھبوں اور ان کی ماہیت و کیفیت سے یہ منطقی نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کو مدت مقررہ سے قبل ہی صلیب سے اتار لیا گیا اور صلیب دینے کے قانونی تقاضے پورے نہیں ہو سکے۔ پس یہ انکشاف عیسائیت کی موجودہ تعلیم کو بھی غلط قرار دیتا ہے اور ماضی کی تعلیم کو بھی ناقص ٹھہراتا ہے۔" (8)

آپ نے دیکھا کہ رومن کیتھولک دانشور نے پوپ جیسی قابل احترام شخصیت کو کیسا جرات مند خط لکھا۔ اس مسیحی دانشور میں یہ جرات کیسے پیدا ہو گئی کہ وہ اپنے روحانی پیشوا کو چیلنج کر رہا ہے۔ یقیناً اس کی بڑی وجہ اس مقدس چادر کے بارے میں وہ حقائق ہیں جو جرمنی کے "ادارۂ تحقیقات کفن مسیح" کے انکشافات کے بعد دنیا کے سامنے آئے لیکن ایسے انکشافات کے باوجود بھی کوئی محقق اپنے روحانی پیشوا سے اس قدر بیباکانہ لہجے میں مخاطب نہیں ہو سکتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کی اصل وجہ کیا ہے ؟ اس کی اصل وجہ وہ روحانی نظارہ ہے جو "کرٹ برنا" کو دکھایا گیا چنانچہ ایک یورپی مورخ ہولگر کرسٹن (Holger Kersten) نے مسٹر کرٹ برنا کے حوالے سے

لکھا ہے کہ :-

"۱۹۴۷ء میں مسٹر کرٹ برنا نے ایک نظارہ دیکھا جس میں یسوع ظاہر ہوئے اور انہوں نے مسٹر برنا کو اس امر کا اختیار دیا کہ وہ دنیا کے سامنے اعلان کر دے کہ جس شخصیت (یسوع) کو صلیب پر چڑھایا گیا تھا وہ ظاہری طور پر مردہ معلوم ہو رہا تھا جبکہ درحقیقت اس پر ایک قسم کی غشی طاری ہو گئی تھی اور تین دن کے بعد وہ اس غشی کے عالم سے نکل آیا تھا۔" (9)

کوئی شخص اخلاقی لحاظ سے کتنا بھی گر جائے اس کے باوجود اپنے روحانی پیشوا کے بارے میں صریح کذب بیانی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ یوں بھی مسیحی دنیا کرٹ برنا کو ایک ایسے مسیحی کی حیثیت سے جانتی ہے جس نے حضرت مسیحؑ کو اپنا نجات دہندہ اور خدا کا مقدس پیغمبر تسلیم کیا تھا۔ اس (کرٹ برنا) کے کردار میں کوئی خامی بھی نہیں پائی گئی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کے سامنے (عالم کشف میں) حضرت مسیحؑ ظاہر نہ ہوئے ہوں اور اس نے ایک جھوٹا اعلان کر دیا ہو جبکہ یہ اعلان مذہبی معاشرتی اور مالی غرض کسی بھی پہلو سے اس کے لئے مفید نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ وہ جس معاشرہ میں زندگی گذار رہا تھا وہ خالص مسیحی معاشرہ تھا' اس کا خاندانی ماحول' گھر کا ماحول' اردگرد کا ماحول حتیٰ کہ سارے ملک کا ماحول مکمل مسیحی ماحول تھا۔ اس ماحول میں ہر شخص حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیتا تھا اور ہر طرف اسی عقیدے کی حکمرانی تھی کہ جناب مسیحؑ صلیب پر فوت ہو کر دوبارہ جی اٹھے تھے اور آسمان پر خدا کے دائیں طرف تشریف فرما ہیں۔ اس عقیدے سے اختلاف کر کے اس کے بالکل برعکس عقیدے کا اعلان کرنا بہت دل گردے کا کام ہے کیونکہ اس میں سرا سر نقصان ہے۔ یہ تو مصائب و آلام کو خود دعوت دینا ہے۔ اس کے باوجود مسٹر کرٹ برنا نے یہ اعلان کیا کہ مسیحؑ صلیب سے زندہ اتار لئے گئے تھے۔ اس طرح انہوں نے مسیحی عوام الناس کے ساتھ ساتھ پوپ کو بھی اپنا دشمن بنا لیا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ ممتاز یورپی مصنف مسٹر ہولگر کرسٹن نے لکھا ہے کہ جب مسٹر کرٹ برنا نے حضرت مسیحؑ کے بارے میں یہ اعلان کیا تو :-

"مسٹر برنا کو دھمکیاں دی گئیں انہیں شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے وہ بے چارہ سخت قسم کی جسمانی نفسیاتی اور مالی مشکلات سے دو چار ہوا۔" (10)

اس سے پوری طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ کرٹ برنا نے یقیناً عالم کشف میں حضرت مسیحؑ کو دیکھا اور انہوں نے مسٹر برنا کو یہ اعلان کرنے کی ہدایت فرمائی کہ جناب مسیحؑ کو صلیب سے زندہ حالت میں اتار لیا گیا تھا۔ ان پر شدید قسم کی غشی طاری ہو گئی تھی جسے موت سمجھ لیا گیا تھا۔

مقدس چادر کا سائنسی تجزیہ

کرٹ برنا نے پوپ کے نام اپنے خط میں یہ درخواست کی تھی کہ اس مقدس چادر کا سائنسی تجزیہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس درخواست نے رفتہ رفتہ مطالبے کی صورت اختیار کر لی کیونکہ بہت سے مسیحی دانشور مسٹر برنا کے ہمنوا ہو گئے۔ آخر کار پوپ کو یہ مطالبہ تسلیم کرنا پڑا چنانچہ ۱۹۶۹ء میں "تورین چرچ" (جس گرجا میں مقدس چادر محفوظ ہے) کے سربراہ پیلی گرینو (Pelle Grino) نے سائنس دانوں کی ایک ٹیم نامزد کی۔ اس میں اعلیٰ مرتبے کی مذہبی شخصیات کو بھی شامل کیا۔ ان اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ذمہ دار اصحاب کو مقدس چادر کا باقاعدہ تجزیہ کرنے کا کام سونپا گیا۔ ابتداء میں اس کمیشن کے اراکین کی تعداد صرف گیارہ تھی لیکن بعد کے برسوں میں ایسے تمام اداروں اور یونیورسٹیوں کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا جو اس معاملہ میں دلچسپی رکھتے تھے اور جن میں اس مقدس چادر کا تجزیہ کرنے کی اہلیت و صلاحیت تھی حتیٰ کہ امریکہ کا مشہور تحقیقاتی ادارہ ناسا (Nasa) بھی اس مقدس چادر کی اصلیت و حقیقت معلوم کرنے والوں میں شامل ہو گیا اس طرح مقدس چادر کی تحقیق کرنے والوں کی تعداد چار سو تک پہنچ گئی۔ (11)

۱۹۶۹ء تک تحقیق کا دائرہ مقدس چادر کی تصاویر (فوٹو گرافس) تک محدود رہا لیکن ۱۹۶۹ء میں پہلی بار سائنس دانوں کی اس جماعت نے دو دن تک مقدس چادر کا مشاہدہ و معائنہ کیا۔ اس کام کو اس قدر خفیہ رکھا گیا کہ ۱۹۷۶ء تک اس کمیشن کے اراکین

کے نام تک کسی کو معلوم نہ تھے نہ یہ معلوم تھا کہ اس چادر کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے۔ ابتدائی تجربات کے نتائج بہت ناکافی تھے۔ فوٹو گرافس کے رنگدار پرنٹ کا بغور معائنہ کیا گیا اس کے بعد مقدس چادر کے تمام حصوں کا خوردبین سے معائنہ و مشاہدہ کیا گیا۔ عام روشنی اور الٹراوائلٹ روشنی میں بھی چادر کے ایک ایک حصہ کو دیکھا گیا لیکن کوئی خاص نتیجہ نہ نکل سکا اور کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ مزید تحقیق کے لئے چادر کے چھوٹے نمونے حاصل کیئے جائیں آخر کار مقدس چادر کے قانونی وارث اٹلی کے معزول شاہ امبر ٹوثانی (Umber To II) نے اپنی جلا وطنی کی قیام گاہ سے کمیشن کی سفارش قبول کر لی مگر اس کے ٹکڑے حاصل کرنے کا مرحلہ ابھی نہیں آیا تھا۔ ۱۹۷۳ء میں اس مقدس چادر کا ایک بار پھر معائنہ کیا گیا جو مسلسل تین دن تک جاری رہا۔ اس بار اسے ٹیلی ویژن پر بھی دکھایا گیا۔ دنیا کے لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں نے اس چادر کو دیکھا، اس موقع پر پوپ پال ششم نے قوم سے خطاب بھی کیا۔ اسی سال یعنی ۱۹۷۳ء میں اس کا ایک ایسا ٹیسٹ کیا گیا جس نے حقیقت ساری دنیا پر بے نقاب کر دی جس کی تفصیل یہ ہے:۔

اس چادر پر خون کے جو دھبے (داغ) پڑے ہوئے ہیں انہیں کلید کی حیثیت حاصل ہے اگر لیبارٹری میں تجزیہ کرنے کے بعد یہ ثابت ہو جائے کہ یہ نشان کسی پینٹر یا مصور کے برش کا کرشمہ ہیں تو ساری چادر جعلی ثابت ہو گی اور ایک گھناؤنا کھیل نظر آئے گا۔ سائنس اتنی ترقی کر چکی ہے اور جدید ترین اور اعلیٰ ترین تجزیاتی آلات سے مزین لیبارٹریاں یورپ بھر میں موجود ہیں کہ ان میں کسی بھی مادے کی قلیل ترین مقدار کا جائزہ لے کر سب کچھ معلوم کر لیا جاتا ہے اور کوئی چیز پوشیدہ رہ سکتی ہی نہیں۔ اس طریقہ تحقیق کو انگریزی میں پیرواکسائیڈ ری ایکشن (Peroxide Reaction) کہتے ہیں اس کے ذریعے سے خون کے دھبے کے چھوٹے سے چھوٹے نشان کا تجزیہ کر لیا جاتا ہے۔

عظیم حقیقت کا انکشاف

اس چادر کے تجزیے کے لئے بھی اس طریقہ تحقیق کو اختیار کیا گیا اٹلی میں

موجود اعلیٰ درجے کی لیبارٹریوں سے مدد لی گئی اور خون کے دھبوں والے دھاگوں کا بغور معائنہ کیا گیا۔ جائزے اور تجزیے کے بعد معلوم ہوا کہ چادر پر دو مختلف قسم کے دھبے ہیں ایک قسم تو خون کے دھبوں کی نہیں ہے (یہ دھبے حضرت مسیحؑ کے جسم سے اٹھنے والے بخارات اور چادر پر موجود محلول کے امتزاج سے رونما ہوئے۔ مولف) آگے چل کر تجزیاتی رپورٹ میں بتایا گیا کہ:۔

" دوسرے دھبے (بلا شبہ) خون کے ہیں۔" یہ وہ خون ہے جو اس وقت بہا تھا جب حضرت مسیحؑ کو صلیب سے اتار کر اس چادر میں لپیٹا گیا تھا" (12)

دو ہزار سال کے بعد پہلی بار سائنسی بنیاد پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ اس مقدس چادر میں واقعی حضرت مسیحؑ کو لپیٹا گیا تھا حتیٰ کہ تجربہ کرنے کے بعد یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضرت مسیحؑ کے خون کا گروپ کیا تھا۔ چنانچہ مقدس چادر کی برٹش سوسائٹی کے ایک ممبر مسٹر روڈنی ہورے (Rodney Horey) نے اپنی کتاب ٹسٹی مونی آف دی شراؤڈ" (Testimony Of The Shroud) میں اپنی چھ سالہ تحقیقات کا نچوڑ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اٹلی کے سائنس دانوں کی ایک ٹیم نے جو سائنسی تجزیہ کیا ہے اس کی رو سے ثابت ہو گیا ہے کہ اس چادر پر جو دھبے ہیں وہ صرف انسانی خون ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں کسی رنگ وغیرہ سے ایسے دھبے پیدا ہو سکتے ہی نہیں۔ ابتداء میں امریکی ماہرین کی تحقیقاتی ٹیم نے اس رپورٹ کو رد کر دیا تھا مگر اب وہ بھی اس نتیجہ پر پہنچی ہے (کہ مقدس چادر پر خون ہی کے دھبے ہیں) اٹلی کے سائنس دانوں نے تو یہاں تک شناخت کر لیا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے خون کا گروپ کیا تھا سائنسی تجزیئے کے مطابق حضرت مسیحؑ کے خون کا گروپ A _ B ہے (13)

اصولی طور پر یہ بحث ختم ہو جانی چاہئے تھی کیونکہ سائنس دانوں کی طویل اور سائنٹیفک تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ حضرت مسیحؑ کو صلیب پر چڑھایا ضرور گیا مگر شدید بیہوشی کی حالت میں اتار لیا گیا پھر انہیں ایک چادر میں لپیٹ کر ایک غار نما قبر میں رکھ دیا گیا اس چادر پر ان کی شبیہ کا عکس اور خون کے دھبوں نے ثابت کر دیا کہ یہ وہی چادر ہے جس میں انہیں لپیٹا گیا تھا' سائنسی تجزیئے سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ

یہ خون مصنوعی یا جعلی نہیں بلکہ انسانی خون ہے مگر چونکہ اس سائنسی تحقیق سے موجودہ مسیحیت کی وہ ساری عمارت زمین بوس ہو گئی تھی جس کی بنیاد پولوس نامی مسیحی مناد نے رکھی تھی اس لئے بنیاد پرست مسیحی اکابر نے پوپ کو مجبور کیا کہ وہ اس چادر کا "ریڈیو کاربن" ٹیسٹ کروائے تاکہ کچھ مدت کے لئے اس عمارت کو دوبارہ کھڑا کیا جا سکے۔

کاربن ۱۴ ٹیسٹ

قدیم اشیاء کی عمر معلوم کرنے کے اس طریق کار کو "ریڈیو کاربن ۱۴ ڈیٹنگ" کہتے ہیں اس طریقہ تحقیق سے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ جو چیز ٹیسٹ کی جا رہی ہے اس کی زائل ہو جانے والی مدت کتنی ہے اور اس کی اپنی عمر کتنی ہے۔ آخر ۲۱ اپریل ۱۹۸۸ء کو سینٹ جان کے بپٹسٹ کیتھڈرل (Cathedral Of St. John The Baptist.) سے تعلق رکھنے والے پادریوں کی ایک مجلس کے ممبروں نے ۲ ۲/۳ انچ سائز کے ٹکڑے کو چادر سے کاٹا اور اسے تین چھوٹے نمونوں میں تقسیم کر دیا اور پھر انہیں اسٹین لیس اسٹیل کے سلنڈروں میں بند کر کے ان پر آرچ بشپ کی مہر لگائی اور ان نمونوں کو امریکہ کے ایری زونا (Arizona) یونیورسٹی' انگلینڈ کی آکسفورڈ یونیورسٹی اور سوئس فیڈرل انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کی خصوصی لیبارٹریوں کو بھیج دیا گیا جہاں اس چادر کے نمونوں کے ٹیسٹ کئے گئے اور پھر ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۸ء کی ایک صبح کو دس بجے کے قریب مسیحی روحانی پیشوا کارڈینال بلسٹریو (CardinaL Ballestreo) نے ویٹیکن کی طرف سے ایک سرکاری اعلان پڑھ کر سنایا۔ بیان میں کہا گیا تھا کہ:

"تینوں سائنسی کمیٹیاں ایک ہی نتیجے پر پہنچی ہیں اور یہ نتیجہ ۹۵ فی صد قابل اعتماد ہے کہ وہ چادر جو حضرت مسیحؑ کے کفن سے منسوب کی جاتی ہے ۱۲۶۰ء اور ۱۳۹۰ء کے درمیان تیار کی گئی تھی۔ گویا لینن کا یہ کپڑا جو تورین کی چادر (Turin Shroud) کے نام سے مشہور ہے) وہ کپڑا نہیں جو یسوع کے بدن کے گرد لپیٹا گیا تھا۔"

اس طرح بنیاد پرست مسیحی رہنما اور کلیسیا ملبے کی اینٹوں سے پولوس کی تعمیر کردہ

عمارت کو از سر نو تعمیر کرنے میں بظاہر کامیاب ہو گئے مگر اس اعلان کو بعض لوگوں نے سوچا سمجھا منصوبہ قرار دیا اور خود یورپ کے مسیحی دانشور جو مذہب پر پورا یقین رکھتے ہیں کارڈینال بلسٹریو کے اس اعلان سے مطمئن نہیں ہوئے کہ یہ چادر جعلی ہے سب سے بڑا مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ کیا "ریڈیو کاربن ۱۴" نامی طریقہ تحقیق سو فی صد تسلی بخش ہے اور اس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے؟ اس سے بھی اہم بات یہ کہ کیا اس چادر کا سائنسی تجزیہ ریڈیو کاربن ۱۴ کے ذریعہ سے ہو بھی سکتا ہے؟

پہلے ہم اس دوسرے سوال کا جواب دیتے ہیں۔

(۱) "ریڈیو کاربن ۱۴" کے ذریعے تجزیہ ان اشیاء کا کیا جاتا ہے جو گرد و غبار اور بیرونی اثرات سے محفوظ رہیں لیکن جس چیز پر مٹی جم جائے بیرونی ہوا اور خشکی اپنا اثر ڈالے یا بارہا بار ہاتھ لگیں اس کی مدت عمر کا صحیح اندازہ "ریڈیو کاربن ۱۴" کے ذریعے سے لگایا ہی نہیں جا سکتا۔ حضرت مسیحؑ کو جس چادر میں لپیٹ کر ان کی عارضی قبر میں رکھا گیا تھا اسے تو بار بار حادثات کا شکار ہونا پڑا۔ درجنوں بار اسے ایک شہر سے دوسرے شہر لے جایا گیا۔ فوجیوں کی لوٹ کا شکار ہوئی۔ کئی سو سال ایک دیوار کے طاق میں بند رہی۔ چاندی کے جس بکس میں اسے محفوظ کر کے گرجا میں رکھا گیا تھا وہ گرجا شعلوں کی لپیٹ میں آ کر تباہ ہو گیا۔ اس تباہی سے چادر بھی محفوظ نہ رہ سکی اور چاندی کے بکس میں آگ لگ جانے کی وجہ سے چادر کے بعض حصے جھلس گئے۔ اس بکس کو پانی میں ڈال کر آگ بجھائی گئی اس طرح چادر پہلے آگ اور پھر پانی سے بری طرح متاثر ہوئی پھر ننوں کی ایک جماعت نے اس پر رفو کا عمل کیا' لاکھوں مسیحیوں نے اسے چھوا اور بوسے دیئے اس طرح یہ چادر اپنی اصلی حالت میں محفوظ نہ رہ سکی جو ریڈیو کاربن ۱۴ کے تجزیے کے لئے ضروری ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ مشہور مورخ مسٹر انتھونی کو کہنا پڑا کہ :۔

"اس چادر کو بہت سے تجربات کا نشانہ بننا پڑا' ایک سے زیادہ بار اسے تیل میں ڈالا گیا' ابالا گیا اور دھویا گیا۔" (14)

کوئی بتائے کہ اس چادر میں اب کیا باقی رہ گیا جس کا تجزیہ "ریڈیو کاربن ۱۴" کے ذریعے کیا جائے۔ اگر یہ چادر کسی عمارت میں یا کسی بکس میں مسلسل محفوظ رہی ہوتی تب کاربن ۱۴ کے ذریعے سے اس کا تجزیہ سائنسی عمل کہلا سکتا تھا' موجودہ صورت میں اس کا تجزیہ سراسر غیر سائنسی عمل ہے۔

(۲) اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ نہیں' موجودہ صورت اور حالت میں بھی اس کا سائنسی تجزیہ "ریڈیو کاربن ۱۴" کے ذریعے سے کیا جا سکتا ہے تو ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے خود سائنس داں یہ کہہ رہے ہیں کہ "ریڈیو کاربن ۱۴ ڈیٹنگ" کا طریقہ تحقیق جس سے قدیم اشیاء کی عمر معلوم کی جاتی تھی اب مشکوک ہو گیا ہے چنانچہ اس کا عملی مشاہدہ ہوا جس کی رپورٹ سائنس کے ایک جرنل میں شائع ہوئی' ایک اقتباس :۔

"ریڈیو کاربن ڈیٹنگ" طریقہ تحقیق کے بارے میں بعض غلطیوں کا پہلی بار انکشاف ہوا ہے جس سے یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ اس طریقے سے اشیاء کی عمر کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا چنانچہ حال ہی میں ایک لیبارٹری میں ایک ایسی چیز لائی گئی جس کی صحیح عمر کا علم تھا لیکن "ریڈیو کاربن ۱۴" کے ذریعے کیے جانے والے تجزیے نے اس کی عمر حقیقی عمر سے ڈھائی سو سال زیادہ بتائی پس ثابت ہو گیا کہ یہ طریقہ تحقیق غلطیوں سے پاک نہیں ہے چنانچہ سائنسی اور انجینئرنگ پر تحقیق کے بارے میں برطانوی ادارے سیرک (Serc) نے اس مسئلے پر معلومات جمع کرنے کے لئے ایک کمیشن قائم کیا اس کمیشن کی تحقیق کے مطابق ۲۸ لیبارٹریوں میں قدیم اشیاء کے جو تجزیے کیے گئے ان میں سے صرف سات نتائج درست ثابت ہوئے باقی ۲۱ غلط اور غیر تسلی بخش تھے۔ اس جائزے کی تفصیل یوں ہے کہ کوئلے اور کاربونیٹ کے متعدد نمونے "ریڈیو کاربن ۱۴" کے ذریعے تجزیے کی غرض سے ۲۸ لیبارٹریوں کو فراہم کئے گئے جب نتائج موصول ہوئے تو معلوم ہوا کہ بیشتر لیبارٹریوں نے ان اشیاء کی عمر کے جو اندازے لگائے وہ ۳۲۲ گنا غلط تھے (15)

یورپ کے ایک ممتاز مسیحی دانشور مسٹر کنتھ ای اسٹی ونسن (Mr kenneth E. Stevenson) مقدس چادر سے متعلق معاملات کے بہت

بڑے ماہر ہیں انہوں نے کاربن ۱۴ اور اس کے طریقہ کار پر تحقیقی کام کیا ہے جو بلاشبہ پڑھنے والے کی آنکھیں کھول دیتا ہے۔ موصوف نے اپنی کتاب میں جو نکات اٹھائے ہیں ان کی رو سے کاربن ۱۴ کے ذریعے اس چادر کا تجزیہ کرتے ہوئے دانستہ یا نادانستہ طور پر بہت سی کوتاہیاں ہوئیں یہ ایسی کوتاہیاں ہیں جنہوں نے اس سارے عمل کو بری طرح متاثر کیا۔ مثال کے طور پر:۔

(۱) طے یہ کیا گیا تھا کہ مقدس چادر کا دوبار تجزیہ کیا جائے گا دوسری بار اس لئے تاکہ پہلے تجزیے کی تصدیق ہو سکے لیکن تجزیہ صرف ایک بار کیا گیا اس طرح یہ عمل مشکوک ہو گیا۔ (15-A)

پھر نتیجے کے اعلان میں غیر معمولی عجلت سے کام لیا گیا چنانچہ مسٹر اشی ونسن وٹیکن سے سوال کرتے ہیں کہ:۔

"آکسفورڈ لیبارٹری کی رپورٹ اس لئے بھی ناقابل اعتماد ہو جاتی ہے کہ اس سائنسی ادارے کو اتنی جلدی کیا تھی کہ ایک ہی تجزیے (ٹسٹ) کے بعد اس نے مقدس چادر کے جعلی ہونے کا فیصلہ سنا دیا جو اس ادارے نے خود ہی تیار کیا تھا حالانکہ اس شعبے میں اسے زیادہ تجربہ بھی حاصل نہ تھا اور نہ "کاربن ۱۴" کی پہلی بوجھنے والا یہ واحد ادارہ تھا (15 B)

(۲) زیورچ لیبارٹری کے ماہر ڈاکٹر ویلی ولفی (Dr. Welly Wolfi) نے مصری "بل ممیوں" (Bull Mummys) کا اسی کاربن ۱۴ کے ذریعے تجزیہ کیا تھا۔ انہوں نے اس مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے بتایا کہ صرف ایک بار تجزیہ (ٹسٹ) کرنے سے کوئی حتمی تاریخ (کسی چیز کی قطعی اور درست عمر کے بارے میں) معلوم نہیں کی جا سکتی اور اس خصوصی کپڑے (مصری ممیوں کے گرد لپٹے ہوئے کپڑے) کے سلسلے میں تو لازمی ہے کہ اس کے کم از کم ۱۴ ٹسٹ لے جائیں۔ اگرچہ یہ بھی کم ہوں گے (15 C)

اعترافِ ناکامی

کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں کہ اس مقدس چادر کا صرف ایک ٹسٹ لے کر ہی پیچھا چھڑا لیا گیا حالانکہ زیورچ لیبارٹری کے ماہر ڈاکٹر ولفی کی رپورٹ کے مطابق

مقدس چادر کے بھی کم سے کم ۱۴ ٹسٹ ہونے چاہئے تھے۔

(۳) دلچسپ بات یہ ہے کہ جن تین لیبارٹریوں نے مقدس چادر کا تجزیہ کیا ان میں سے ایک لیبارٹری یعنی آکسفورڈ لیبارٹری نے خود اعتراف کیا کہ:۔

"پانچ میں سے ایک نتیجہ ہمارے اندازوں کے برعکس ہوتا ہے۔" (15 D)

گویا اس چادر کا تجزیہ کرنے اور اس کے جعلی ہونے کا سرٹیفکیٹ جاری کرنے والا ادارہ خود اعتراف کر چکا ہے کہ اس طریقہ کار پر سو فی صد اعتماد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ پانچ میں سے ایک نتیجہ غلط بھی ہو سکتا ہے بلکہ (یقینی طور پر) غلط ہوتا ہے۔ اس صورت میں اس ادارے کے جاری کردہ سرٹیفکیٹ کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔

(۴) "کاربن ۱۴" کے ذریعے تجزیہ ہمیشہ اصل اور محفوظ چیز کا ہوتا ہے پیوند کاری کی ہوئی چیز کا نہیں ہوتا لیکن مقدس چادر کا تجزیہ کرنے کے لئے عجیب ڈرامہ رچایا گیا یعنی چادر کا جو حصہ ۱۵۳۲ء میں آگ لگنے سے جل گیا تھا اور جسے "ننوں" کی ایک جماعت نے رفو کیا تھا اس سے صرف دو تین سنٹی میٹر کے فاصلے سے ایک ٹکڑا کاٹ کر تجزیے کے لئے بھیجا گیا۔ (15 E)

عجیب بات یہ ہے کہ اس چادر کے تین نمونے حاصل کئے گئے جو تین مختلف لیبارٹریوں کو بھیجے جانے تھے اور یہ تینوں نمونے مقدس چادر کے اس حصے کے قریب سے کاٹے گئے جو رفو شدہ تھا۔

(۵) مقدس چادر کا جو ٹکڑا تجزیے کے لئے دیا گیا اس میں ایسا کپڑا بھی شامل تھا جو اصل چادر کا جزو نہ تھا (یہ وہ کپڑا تھا جو رفو کرنے والی ننوں نے اصل چادر کے نیچے مضبوطی کے لئے لگا دیا تھا) (15 F)

کیا یہ انتہائی قابل مذمت کوتاہی نہیں کہ اصل کپڑے کے ٹکڑے کے ساتھ اس کپڑے کا ٹکڑا بھی تجزیے کے لئے بھیج دیا گیا جو اصل چادر کا حصہ نہیں تھا بلکہ اس کپڑے کا ٹکڑا تھا جو رفو کرنے والی "ننوں" نے بعد میں چادر کی مضبوطی کے لئے لگا دیا تھا۔ کیا اس تجزیے کے بعد جو نتیجہ حاصل ہوا اسے درست قرار دیا جا سکتا ہے۔

(۶) کسی بھی چیز کا' کاربن ۱۴ کے ذریعے تجزیہ کرنے سے پہلے ضروری ہوتا ہے کہ اسے ہر قسم کی آلودگی سے صاف کر لیا جائے ورنہ آلودگی والی چیز کا صحیح تجزیہ ہرگز نہیں ہو سکے گا مگر:۔

"کاربن ۱۴ کا کوئی ذمہ دار ماہر یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ اس متبرک چادر کی عمر معلوم کرنے کے لئے اسے بیرونی آلودگی سے مکمل طور پر صاف کر لیا گیا تھا (15 E)

سوال کیا جا سکتا ہے کہ آخر مقدس چادر کی عمر کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے اس کے اس ٹکڑے کو آلودگی سے صاف کیوں نہیں کیا گیا جسے تجزیے کے لئے بھیجا گیا تھا ؟ کیا اس لئے کہ اس صورت میں امکان تھا کہ اس کی صحیح عمر نہ معلوم ہو جائے اور کلیسیا کی ساری عمارت زمین پر نہ آ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مقدس چادر کے کاربن ۱۴ کے ذریعے ٹسٹ ہو گئے اور ان کی رپورٹ شائع ہوئی تو ایک برطانوی ماہر ڈاکٹر گووے (Dr. Gove) نے برطانوی عجائب گھر کو جو اس ٹسٹ میں شامل تھا ایک سخت خط لکھا کہ :۔

"متبرک چادر کے ٹسٹوں کے بارے میں بہت سے لوگ شک میں ہیں۔ میں سخت حیران ہوں کہ تم لوگوں نے برطانوی عجائب گھر کی شہرت کو سخت نقصان پہنچایا جس کی وجہ سے اس ادارے کی حیثیت مشکوک ہو کر رہ گئی ہے۔" (15 H)

ڈاکٹر گووے نے اپنے خط میں جن کوتاہیوں کی نشاندہی کی ہے ان میں سے ایک بہت بڑی کوتاہی یہ تھی کہ :۔

"مقدس چادر کو گرجا میں آگ سے سخت نقصان پہنچا تھا۔ ۳۰۰ ڈگری گرمی میں بھی کپڑے کی ہیئت تبدیل ہو جاتی ہے مقدس چادر تو ۳۹۶۰ ڈگری کی لپیٹ میں آئی تھی۔ چاندی کا صندوق جس میں یہ چادر محفوظ تھی اور اس کا ریشمی غلاف بھی جل گیا تھا۔ اس طرح چاندی کے بکس اور ریشمی غلاف کے جلنے سے جو غیر مرئی ذرات یا سالمے (Molecules.) پیدا ہوئے ہوں گے وہ مقدس چادر کے ذرات (سالموں) میں گڈمڈ ہو گئے ہوں گے اس طرح مقدس چادر اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں رہی ہو گی۔ (15 - i)

ڈاکٹر گووے کا اعتراض یہ ہے کہ کاربن نمبر ۱۴ کے ذریعے جس چیز کا تجزیہ کیا جاتا ہے اس کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ اپنی اصلی حالت میں ہونا چاہئے جو چادر اتنی بڑی بڑی تبدیلیوں سے گذری اور خارجی اثرات سے بری طرح متاثر ہوئی اس کا صحیح تجزیہ ہو سکتا ہی نہیں۔ گویا تجزیہ اس چادر کا نہیں ہوا جسے حضرت مسیحؑ کے گرد لپیٹا گیا تھا بلکہ ایک اور چادر کا ہوا جو قریباً" پانچ سو سال بعد "تیار" کی گئی تھی۔

(۷) اس دوران ایک اور سوال پیدا ہوا کہ کاربن ۱۴ کا طریقہ کار کیا سو فی صد قابل اعتماد ہے ؟ اس سوال کا صحیح جواب ہمیں اس وقت ملا جب مصر کی "بل ممیوں" (BULL MUMMYS.) کا تجزیہ کرنے کے لئے کاربن ۱۴ کا طریقہ آزمایا گیا۔ تجزیہ کرنے کے بعد جو نتیجہ نکلا وہ یہ تھا کہ ان ممیوں کے گرد جو کپڑا لپٹا ہوا ہے اس کی عمر 3410 سال اور 4517 سال کے درمیان ہے۔ (15 - J)

اندازہ فرمائیے کہاں تین ہزار چار سو دس اور کہاں چار ہزار پانچ سو سترہ ؟ یعنی سو دو سو نہیں بلکہ پورے گیارہ سو سال کا فرق ؟ گویا یہ سائنسی تجزیہ قطعی طور پر نہیں بتا سکا کہ مصر کی اس ممی کے گرد لپٹے ہوئے کپڑے کی عمر 3410 سال ہے یا 4517 سال ☐ اسے سائنسی تجزیہ کیسے کہا جا سکتا ہے جس میں اردو زبان کے محاورے کے مطابق "تیر تکے" سے کام لیا گیا ہو ؟ ---- "یہ یا وہ" ---- "دو ہزار" یا "تین ہزار"۔ کاربن ۱۴ کے ذریعے مقدس چادر کا تجزیہ کرتے ہوئے بھی اگر ۱۱ سو سال کا فرق پڑ گیا ہو تو کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ اس صورت میں تو مقدس چادر کا زمانہ وہی بنے گا جب حضرت مسیحؑ کو صلیب دی گئی تھی۔

(۸) کاربن ۱۴ کے تجزیے کا ناقص ہونا اس وقت پوری طرح ظاہر ہو گیا جب ایک ایسے قدیمی کپڑے کا تجزیہ کیا گیا جس کی درست عمر کا علم تھا اور وہ تھی 3000 سال قبل مسیحؑ لیکن جب کاربن ۱۴ کے ذریعے اس کا تجزیہ کیا گیا تو اس نے اس کپڑے کی عمر بتائی 2528 سال قبل مسیح گویا 472 سال کا فرق نکلا۔ (15 - K)

کیا اب بھی اس امر میں کوئی شک باقی رہا کہ کاربن ۱۴ کا موجودہ طریقہ حد درجہ ناقابل اعتماد ہے اور اس میں ابھی بہت اصلاح کی ضرورت ہے موجودہ صورت میں کسی

مسئلے کو حل کرنے کے لئے اس طریقے سے مدد لینا نہایت خطرناک بلکہ تباہ کن ہے۔

(۹) اب آخر میں اس طریقہ کار کا ایک انتہائی مضحکہ خیز نتیجہ جس نے اس ساری عمارت کو بنیاد سے ہلا دیا۔ ۱۹۸۲ء میں کیلی فورنیا یونیورسٹی کی لیبارٹری میں جو ایٹمی صلاحیت سے آراستہ تھی اسی مقدس چادر کے ایک دھاگے کا خفیہ طور پر تجزیہ کیا گیا۔ تجزیے نے ایک سرے کی تاریخ تو ۲۰۰ء بتائی اور اسی دھاگے کے دوسرے سرے کی تاریخ ۱۰۰۰ء (15-L)

کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ ایک ہی دھاگے کا ایک سرا تو دو سو عیسوی میں تیار ہوا اور اسی دھاگے کا دوسرا سرا ایک ہزار عیسوی میں۔ کیا یہ ممکن ہے؟ کیا اس سے زیادہ بے عقلی کی بات ہو سکتی ہے؟ وہ بھی سائنس کی دنیا میں؟

کیا اس مشکوک اور مشتبہ طریقے سے حاصل کئے ہوئے کسی نتیجے کو سائنسی نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے اور اس پر اعتبار و اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ پس کلیسا (ویٹیکن) کا یہ سرکاری اعلان کہ یہ چادر وہ نہیں ہے جس میں صلیب سے اتارنے کے بعد حضرت مسیحؑ کو لپیٹا گیا تھا قطعاً ناقابل قبول ہے کیونکہ اس کے پیچھے سیاسی مصلحتیں ہیں، سائنس اور حقائق نہیں۔

تجزیے کی غلط بنیاد؟

اس چادر کے تجزیے کے سلسلے میں ایک بنیادی بات قطعاً نظر انداز کر دی گئی وہ یہ کہ "ریڈیو کاربن ۱۴" کے ذریعے تجزیہ کرنے کے لئے کسی چیز کی خاصی بڑی مقدار کی ضرورت ہوتی ہے اور اس سے قبل یہی کہا جاتا تھا اگر اس چادر کا "ریڈیو کاربن ۱۴" کے ذریعے تجزیہ کیا گیا تو چادر تباہ ہو جائے گی کیونکہ اس کا خاصا بڑا حصہ کاٹنا پڑے گا۔ یہ بھی کہا گیا کہ:-

"اب ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ اس تجزیے کی خاطر مسیحیوں کی اس متبرک ترین یادگار کو تباہ کر دیا جائے اور اگر اس سائنسی تجزیے نے ثابت کر دیا کہ یہ چادر اصلی ہے جس

میں واقعی حضرت مسیحؑ کو لپیٹا گیا تھا تو اس کے ایک ٹکڑے کو کاٹ کر ضائع کرنا اس مقدس یادگار کی بے ادبی کرنے کے مترادف ہوگا۔" (16)

اس لئے مخالفت کی گئی کہ اس چادر کا ٹکڑا کاٹ کر اس مقدس یادگار کی بے ادبی نہ کی جائے، گویا ریڈیو کاربن کے ذریعے اس چادر کا تجزیہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ درمیانے درجے کے رومال کے برابر اس کا ٹکڑا کاٹ کر لیبارٹری کو نہ دیا جاتا اور درمیانے درجے کے رومال کا سائز عام طور پر ۱۷x۱۷ انچ ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس چادر کا جو حصہ لیبارٹری ٹیسٹ کے لئے دیا گیا وہ کتنا تھا؟ آپ یہ سن کر حیرت زدہ رہ جائیں گے کہ اس کا سائز ۲ ۲/۳ انچ کا تیسرا حصہ تھا (۴۴۴ء اعشاریہ چار چار، چار انچ) یعنی نصف مربع انچ سے بھی کم غور کیجئے کہاں ۱۷ مربع انچ اور کہاں نصف مربع انچ سے بھی کم۔ یعنی اس چادر کی اصلیت اور حقیقت معلوم کرنے کے لئے ضروری تھا کہ لیبارٹری میں اس کے ۱۷ مربع انچ کے تیسرے حصے کا تجزیہ کیا جاتا اور تجزیہ کیا گیا ۲ ۲/۳ مربع انچ کے تیسرے حصے کا جو نصف مربع انچ سے بھی کم بنتا ہے۔ گویا یہ تجزیہ ہی غلط بنیاد پر ہوا جو کسی بھی معقولیت پسند آدمی کے لئے قابل قبول نہیں یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ اسے ویٹیکن کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ قرار دیتے ہیں۔

چادر مقدس کیوں؟

دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک طرف تو (پادری) "کارڈینال بلسٹریو" چرچ کی طرف سے اعلان کرتے ہیں کہ یہ چادر وہ نہیں ہے جس میں حضرت مسیحؑ کو لپیٹ کر ان کی عارضی قبر میں رکھا گیا تھا اور دوسری طرف اسی سانس میں یہ بھی اعلان کیا جاتا ہے کہ:-

"کلیسا واضح کرتا ہے کہ اس چادر پر یسوع کے چہرۂ مبارک کی جو تصویر دکھائی دیتی ہے اسے بدستور وہی عزت و تکریم

حاصل رہے گی جو پہلے حاصل تھی۔"(17)

سوال یہ ہے کہ جب چادر ہی جعلی ہے اور کلیسیا کے اعلان کے مطابق حضرت مسیحؑ کے واقعہ صلیب کے چھ سو سال بعد تیار کی گئی تو اس پر ثبت شدہ تصویر کیونکر اصلی اور حقیقی ہو گی؟ آخر اس کا ادب اور احترام کیوں کیا جائے گا؟ کیا جعل سازی کی کارروائیوں کا دنیا میں کہیں بھی احترام کیا جاتا ہے؟ اگر واقعی یہ چادر جعلی ہے تو اس اعلان کے بعد اسے نذر آتش کر دینا چاہئے تھا یا زمین میں دفن کر دیا جاتا تاکہ مسیحی دنیا اس دھوکے بازی اور جعل سازی کے بد اثرات سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتی مگر اس اعلان پر تین سال گذر جانے کے باوجود یہ چادر آج بھی بدستور چاندی کے صندوق میں نہایت عزت و احترام کے ساتھ "تورین" کے شاہی گرجا میں رکھی ہوئی ہے اور پوپ کی سرپرستی میں ہر روز درجنوں زائرین اس کے آگے دوزانو ہو کر اسے خراج عقیدت ادا کرتے ہیں۔ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ یہی کہ پوپ اور ان کی انتظامیہ دل سے یقین کرتی ہے کہ یہ حقیقی اور اصلی چادر ہے جس میں حضرت مسیح کو صلیب سے اتارنے کے بعد لپیٹا گیا تھا اگر کلیسیا کے خیال میں یہ چادر جعلی ہوتی تو کبھی اس کا اتنا ادب و احترام نہ کیا جاتا۔

مقدس چادر سے متعلق بعض حقائق

بعض مسیحی بنیاد پرستوں کی طرف سے اس مقدس چادر کی تقدیس کو مجروح کرنے کے لئے کہا گیا ہے کہ یہ چادر چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی کے لگ بھگ فرانس میں تیار کی گئی تھی حالانکہ تاریخی لحاظ سے یہ بہت ہی غلط بات ہے۔ اس چادر کی بُنت (بُنائی) میں ایک دھاگے کی بجائے تین دھاگوں کو بٹ کر استعمال کیا گیا ہے جسے انگریزی میں "فش بون" (Fish Bone) اسٹائل کہا جاتا ہے حضرت مسیحؑ کے وقت اس قسم کی بُنت کا کپڑا فرانس میں عام طور پر استعمال ہی نہیں ہوتا تھا البتہ شام کے علاقے میں اس طرز کا کپڑا تیار کیا جاتا تھا اس لئے شام اور فلسطین میں اس کا استعمال تو سمجھ میں آتا ہے اور اس کپڑے کی چادر میں حضرت مسیحؑ کا لپیٹا جانا قرین

عقل بھی ہے' فرانس میں تو یہ کپڑا تیار بھی نہیں ہوتا تھا نہ اس کا عام استعمال تھا پھر چونکہ اس کی بُنت (بُنائی) میں ایک کی بجائے تین دھاگے بٹ کر استعمال کیے جاتے تھے اس لئے اس کی تیاری پر خرچ کئی گنا زیادہ ہوتا تھا اور یہ بہت قیمتی تھا جسے خریدنا عام آدمی کی دسترس سے باہر تھا۔ حضرت مسیحؑ کے کفن کے لئے اس پائیدار اور قیمتی کپڑے کا بندوبست کرنا ہر آدمی کے لئے ممکن نہ تھا اس لئے یہ سعادت حضرت مسیحؑ کے ایک رئیس عقیدتمند یوسف ارمیتہ کے حصے میں آئی جو دولتمند ہونے کے علاوہ شاہی کونسل کا رکن اور مشیر تھا اور پوشیدہ طور پر حضرت مسیحؑ کو قبول کر چکا تھا۔ اس میں یہی حکمت الٰہی تھی تاکہ حضرت مسیحؑ کے کفن کی یہ چادر طویل مدت تک محفوظ رہ سکے اور حضرت مسیحؑ کے زندہ بچ جانے کے بارے میں وہ شواہد اس کے ذریعے سے منظر عام پر آسکیں جن کی یہ امین ہے ورنہ اگر یہ ایک بُنتی (بُنائی) کی چادر ہوتی تو گل گلا کر اب تک کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی۔

مقدس چادر کی عمر

اس مقدس یادگار پر ایک یہ اعتراض کیا گیا کہ جناب مسیحؑ کے واقعہ صلیب پر دو ہزار سال کے قریب مدت گذر چکی ہے انہیں جس کپڑے میں لپیٹا گیا تھا وہ اتنی لمبی عمر کبھی نہیں پا سکتا کہ اب تک صحیح سلامت موجود ہو۔

ان معترضین نے اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا کہ اول تو یہ ایک دھاگے کی بُنت والا کپڑا نہیں ہے کہ سو دو سو سال میں گل گلا کر ختم ہو جاتا بلکہ اس میں ایک کی بجائے تین دھاگوں کو بٹ کر استعمال کیا گیا ہے اس لئے یہ کپڑا عام کپڑے سے کئی گنا زیادہ مضبوط اور دیرپا ہے دوسری بات یہ کہ جتنی عمر اس کپڑے کی ہے اتنی عمر کے دوسرے کئی کپڑے آج تک صحیح و سالم حالت میں محفوظ ہیں۔ مثال کے طور پر پومپی کے کھنڈرات سے جو کپڑے نکلے تھے ان کی بھی اتنی ہی عمر ہے اور وہ اب تک محفوظ ہیں اور لندن کے عجائب گھر میں انہیں دیکھا جا سکتا ہے آخر وہ کیوں گل گلا کر ختم نہیں ہوئے؟ اس کے علاوہ پیرس برلن اور قاہرہ کے مصری نوادر کے شعبوں میں اس

مقدس چادر سے بھی زیادہ پرانے کپڑے موجود ہیں جن کی عمر ساڑھے تین ہزار سال سے بھی زیادہ ثابت ہو چکی ہے' یہ حقیقت بھی مد نظر رکھنی چاہئے کہ موسمیات کے ماہرین کے تجربات کے مطابق مشرق قریب کی آب و ہوا کپڑوں کو محفوظ رکھنے میں بہت زیادہ مدد گار ثابت ہوتی ہے اور یہ مقدس چادر ابتدائی صدیوں میں فلسطین اور شام کے مضافات ہی میں رہی اس لئے اس کا دو ہزار سال تک صحیح و سالم رہنا ہر گز تعجب انگیز نہیں۔

مقدس چادر کا وطن

مقدس چادر کے بارے میں ایک نئے زاویہ نظر نے حقیقت کے چہرے پر پڑے ہوئے سارے نقاب اٹھا دیئے' وہ زاویہ نظریہ ہے۔

اگر یہ جعلی کارروائی ہے یعنی یہ چادر اگر واقعہ صلیب کے سینکڑوں سال بعد فرانس یا اٹلی میں تیار کی گئی ہے تو اس پر ایشیائی اثرات نہیں پائے جانے چاہیں لیکن سویڈن کے ممتاز ماہر نباتات ڈاکٹر مکس فیری (Dr. Max Farei) نے جب اس چادر کا تجزیہ کیا تو عجیب و غریب حقائق معلوم ہوئے۔ ڈاکٹر فیری کے تجزیے کی بنیاد بھی خالص سائنسی تھی جسے پولین (Pollen) تجزیہ کہتے ہیں۔ اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ جس چیز کا تجزیہ مقصود ہو اس کا خوردبین سے معائنہ کیا جاتا ہے اور اس میں پولین (Pollen) تلاش کیا جاتا ہے یعنی پھولوں کے قلب (وسط) میں پائے جانے والے باریک ذرات (زیرہ یا زرگل) یہ ذرات یا زرِگل یا مادّہ جو بھی نام دے لیں ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہوتے ہیں کہ انہیں باآسانی شناخت کر لیا جاتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر مکس فیری نے :-

(۱) ان پولین مادوں کی ۴۹ اقسام شناخت کر لیں جو مقدس چادر پر موجود تھے۔ ان میں سے گیارہ ایسے پودوں کے ذرّات یا مادّے بھی پائے گئے جو یورپ میں پیدا ہی نہیں ہوتے ہیں لیکن مشرق قریب میں پائے جاتے ہیں جیسے ہالو فائیٹس (Halophytes) کا پودا جو صرف ان ساحلی علاقوں میں نشوونما پاتا ہے جہاں کی آب و

ہوا نمکین ہوتی ہے اور یہ علاقہ بحیرۂ مردار اور اس کے آس پاس کا ہے جو حضرت مسیحؑ کے وطن سے قریب تھا۔ (18)

اس سے ثابت ہوا کہ فرانس اور اٹلی جانے سے قبل یہ چادر فلسطین میں ہی رہی ورنہ اس پر فلسطین میں پائے جانے والے پودوں کے ذرے (زرِگل) کیسے محفوظ ہو گئے۔

(۲) تجزیے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مقدس چادر پر ایک ایسا پولین (زیرہ) موجود ہے جس کے پودے بحیرہ گلیلی (Sea Of Galilee) کی تہہ میں بہت گھنی صورت میں پائے جاتے ہیں اور سب جانتے ہیں کہ گلیلی وہ خاص علاقہ ہے جو حضرت مسیحؑ سے منسوب ہے اور رومی گورنر اور بادشاہ ہیروڈس بھی آپؑ کو "مرد جلیلی" کے لقب سے پکارتے تھے خود حضرت مسیحؑ نے بھی یہ لفظ اپنے لئے استعمال فرمایا تھا چنانچہ واقعہ صلیب کے بعد آپؑ کے دو شاگرد جب پہلی بار آپؑ سے ملے تو حضرت مسیحؑ نے انہیں ہدایت فرمائی کہ " میرے بھائیوں سے کہو کہ گلیلی کو چلے جائیں وہاں مجھے دیکھیں گے۔" (19)

(۳) مقدس چادر پر آٹھ ایسی اقسام کے پولین کے (زیرے یا زرِگل) پائے گئے جو ایشیائے کوچک (ترکیہ) خاص کر اڈیسہ (Edessa) میں پائے جاتے ہیں اور کون نہیں جانتا کہ اڈیسہ وہ ریاست ہے جہاں یہ چادر مدت دراز تک محفوظ رہی تھی اور بار بار اسے کھول کر دیدار عام کے لئے رکھا گیا تھا۔

(۴) پارچات کے ماہر پروفیسر گلبرٹ رائس (Rrof. Gillbert Raes) نے مقدس چادر کے بارے میں ایک نئے زاویے سے تحقیق کی ہے اور بلا شبہ یہ بھی خالص سائنسی تحقیق ہے جس پر مکمل طور پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے بعض دوسرے ماہرین کی طرح کپڑے کی بُنت (بُنائی) پر انحصار نہیں کیا بلکہ اس روئی پر تحقیق کی جو اس کی تیاری میں استعمال کی گئی تھی۔ پروفیسر گلبرٹ رائس کی تحقیق کی رو سے مقدس چادر میں جو روئی استعمال کی گئی تھی زمانہ وسطیٰ میں اس قسم کی روئی یورپ میں نہ تو عام طور پر بوئی جاتی تھی اور نہ وسیع پیمانے پر اس کا استعمال ہی ہوتا تھا اس سے ثابت

ہوتا ہے کہ یہ کپڑا مشرق وسطیٰ میں تیار کیا گیا تھا یورپ میں نہیں (20)

خلاصۂ بحث

ان شواہد کی روشنی میں یہ حقیقت کسی مزید ثبوت کی محتاج نہیں رہتی کہ یہ مقدس چادر نہ فرانس میں تیار کی گئی نہ اٹلی یا کسی یورپی ملک میں بلکہ جس روئی سے اسے بنایا گیا وہ یورپ میں پیدا ہی نہیں ہوتی تھی یہ روئی فلسطین اور شام میں کاشت کی جاتی تھی اور ان دستی کارگاہوں میں اس سے کپڑا تیار کیا جاتا تھا جو فلسطین اور شام میں، قائم تھیں، یہ کپڑا ایک دھاگے سے نہیں بلکہ تین دھاگوں سے بٹ کر تیار کیا جاتا تھا اور اس طرز (اسٹائل) کا کپڑا فرانس اور اٹلی وغیرہ میں مستعمل ہی نہیں تھا پھر یہ اتنا مہنگا تھا کہ عام لوگ اسے خرید کر استعمال نہیں کر سکتے تھے یوسف آف آرمیتہ جیسے رئیس ہی ایسا کپڑا استعمال کرتے تھے جو حضرت مسیحؑ کے دولتمند شاگرد تھے اور جو آپؑ کو کفنانے کے لئے یہ چادر لائے تھے۔ اس چادر پر ان پھولوں کے مادّے (زیرے) کی موجودگی جو صرف فلسطین اور شام یا ترکیہ میں پائے جاتے ہیں یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ ابتدا میں یہ چادر فلسطین ہی میں رہی پھر اسے ترکیہ میں لے جایا گیا اور اس چادر کی تاریخ سے ثابت بھی یہی ہوتا ہے کہ قریباً ایک ہزار سال تک یہ چادر فلسطین اور ترکیہ میں رہی، ترکیہ سے یہ فرانس اور اٹلی میں پہنچی۔

شبیہہ مسیحؑ کا تجزیہ

اس چادر کا تجزیہ کرنے والوں نے اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا کہ مسئلہ چادر کا نہیں، اصل مسئلہ تصویر کا ہے کہ اس چادر پر یہ تصویر کیونکر بن گئی۔

(۱) بعض لوگوں نے کہا کہ تصویر کسی ماہر فن مصور کی "کاریگری" ہے جس نے برش اور رنگوں کی مدد سے یہ جعل سازی کی ہے مگر یہ اعتراض اس لئے نہایت بودا ہے کہ اگر تصویر برش اور رنگوں سے بنائی گئی ہے تو برش اور رنگ کی کوئی ہلکی سی لکیر یا نشان تو چادر پر ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ کوئی مصور کسی کاغذ یا کپڑے پر تصویر بنائے اور آس پاس کے حصوں پر اس کا نشان نہ آئے حالانکہ ۱۹۳۱ء میں حساس ترین کیمروں سے اس چادر اور اس پر مرتسم تصویر کے درجنوں فوٹو گرافس لئے گئے مگر کوئی کیمرہ اس تصویر کے آس پاس کسی رنگ یا مادّے کا کوئی نشان تلاش نہ کر سکا۔

(۲) اس چادر کا سائنسی تجزیہ کرنے والے اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اس مادّے کی نشاندہی نہ کر سکے جس سے یہ تصویر بنائی گئی ہے۔ اگر یہ تصویر مصنوعی ہے اور کسی فنکار نے اسے بنایا ہے تو اس نے کسی قسم کا کیمیکل، کوئی رنگ کوئی مادّہ تو استعمال کیا ہو گا؟ لیبارٹری ٹیسٹ میں یقیناً معلوم ہو جاتا کہ اس تصویر میں فلاں قسم کا رنگ یا مادّہ استعمال کیا گیا ہے مگر تجزیہ نگار بالکل خاموش ہیں اور وہ ایسی کوئی چیز پیش نہیں کر سکے جس سے ثابت کیا جا سکتا کہ یہ تصویر فلاں قسم کے مادّے سے بنائی گئی ہے پس اس سے ثابت ہو گیا کہ اس تصویر میں کوئی مادّہ استعمال نہیں کیا گیا یعنی انسانی ہاتھ کا اس میں ہرگز دخل نہیں۔

(۳) ایک اہم ترین اور بنیادی نکتے کو سرے سے نظرانداز کر دیا گیا وہ یہ کہ مصور کسی شخص یا منظر کی سیدھی تصویر تو بنا سکتا ہے مگر دنیا کا بڑے سے بڑا مصور جدید ترین ٹیکنالوجی کے باوجود کسی کی معکوس (الٹی تصویر) جسے نیگیٹو کہتے ہیں بنانے پر آج تک قادر نہیں ہو سکا نہ ہو سکتا ہے کیونکہ یہ بالکل ناممکن بات ہے جبکہ چادر پر حضرت مسیحؑ کی پازیٹو (Positive) یا مثبت (سیدھی تصویر) نہیں بلکہ نیگیٹو (Negative) ہے جو ہاتھ سے بن ہی نہیں سکتا۔

(۴) یورپ کے ممتاز محقق مسٹر ہولگر کرسٹن (Holger Kersten) نے اس تصویر کا تجزیہ کرتے ہوئے بعض بہت فکر انگیز نکات اٹھائے ہیں مثلاً:

کفن (چادر) پر حضرت مسیحؑ کے برہنہ جسم کی تصویر مرتسم ہے کیونکہ صلیب سے اتارنے کے بعد زمین پر چادر بچھا کر اس کے نصف حصے پر آپؑ کو لٹا دیا گیا اور باقی نصف حصہ سر کی طرف سے گزار کر پیروں تک آپؑ کا جسم چادر سے ڈھانپ دیا گیا آپؑ کے دونوں ہاتھوں کو اوپر نیچے کر کے زیر ناف حصۂ جسم پر رکھ دیا گیا تاکہ ستر پوشی ہو جائے۔ جب حضرت مسیحؑ کے جسم سے پسینہ اور بخارات خارج ہوئے تو جسم

اور چادر پر موجود کیمیائی محلول نے مل کر چادر پر آپؑ کی تصویر ثبت کر دی، قدرتی بات ہے کہ تصویر چادر پر اسی صورت میں نقش ہوئی جس حالت میں آپؑ کا جسم تھا چنانچہ تصویر میں بھی آپ کے دونوں ہاتھ زیر ناف رکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔

جو بات غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ کیا یہ ممکن تھا کہ کوئی مصور حضرت مسیحؑ کی ننگی تصویر بناتا؟ وہ تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا نہ ایسی تصویر بناتے ہوئے اسے کوئی مالی یا ذاتی فائدہ حاصل ہو سکتا تھا۔ حضرت مسیحؑ کو برہنہ دکھانا تو کسی مصور کے لئے ناقابل معافی جرم سمجھا جاتا رہا ہے۔ پس ایسی تصویر جس میں حضرت مسیحؑ کا جسم عریاں نظر آ رہا ہو کسی آرٹسٹ کا "شاہکار" ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کوئی بھی شخص اپنے نبی اور خداوند کی ہتک نہیں کر سکتا، بس اس تصویر کو انسانی ہاتھ کا شاہکار قرار دینا پرلے درجے کی نادانی یا انسانی نفسیات سے ناواقفیت اور نری جہالت ہے۔

(۵) اس حقیقت کی طرف بھی توجہ نہیں دی گئی کہ صلیب کی سزا رومن مملکت میں مستعمل نہیں تھی۔ رومن باشندوں کو صلیب دے کر ہلاک نہیں کیا جاتا تھا سزا کا یہ طریقہ صرف غیر ملکیوں یعنی رومی مقبوضات میں مروج تھا تاکہ ان "غلاموں" پر رومی حکمرانوں کی ہیبت قائم رہ سکے اور وہ اپنے بدیسی آقاؤں کے خلاف سرتابی نہ کر سکیں فلسطین بھی رومن حکومت کا مقبوضہ علاقہ تھا اور یہاں آباد یہودیوں کو قابو میں رکھنے کے لئے صلیب کے ذریعے ہلاک کرنے کا طریقہ رائج تھا جب رومی بادشاہ کنسٹن ٹائن (Constan Tine) نے مسیحی مذہب قبول کر لیا تو ۳۳۰ء میں اس نے صلیب کی سزا اپنے تمام مقبوضات سے مکمل طور پر ختم کر دی کیونکہ یہ حضرت مسیحؑ پر ظلم کی علامت تھی پس تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ باتصویر چادر ۳۳۰ء سے قبل کی ہے کیونکہ اس کے بعد تو صلیب پر سزا دینے کا طریقہ ہی ختم کیا جا چکا تھا۔

(۶) تصویر سے داڑھی اور سر کے بالوں کا جو اسٹائل نمایاں ہے وہ رومی سلطنت میں کسی جگہ بھی عام نہیں تھا صرف فلسطین ہی وہ علاقہ تھا جہاں کے لوگ اس طرز کی داڑھی اور بال رکھتے تھے پس صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ آفت زدہ شخص یہودی قوم

کا کوئی فرد ہے، اس کا فرانس یا اٹلی سے کوئی تعلق نہیں۔

(۷) مقدس چادر پر ثبت شدہ اس تصویر میں زخموں کے وہی چھ مقام نظر آ رہے ہیں جو انجیل میں مذکور ہیں۔ طبی ماہرین نے تصدیق کی ہے کہ تصویر میں دائیں آنکھ کے نیچے شدید قسم کے ورم کے نشانات بھی موجود ہیں جو سرکنڈے یا مکے مارنے سے پیدا ہوئے ہوں گے۔ انجیل کی رو سے گورنر پلاطس کی عدالت میں لے جانے سے قبل چیف کاہن سردار کائفہ کی عدالت میں یہودیوں نے حضرت مسیحؑ کے چہرے پر مکے اور طمانچے مارے تھے (متی کی انجیل باب نمبر۲۶ آیت نمبر۶۷)

(۸) حضرت مسیحؑ کو صلیب پر چڑھانے سے قبل کوڑے مارے گئے تھے تصویر میں یہ نشانات با آسانی دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ تعداد ۹۰ سے بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ رومی، مجرم کو سزا دینے کے لئے جو کوڑا استعمال کرتے تھے اسے فلیگ رم (Flagrum) کہتے تھے۔ یہ ایک خاص قسم کا کوڑا ہوتا تھا جس کے سرے پر چمڑے کے تین تسمے لگے ہوتے تھے اور ہر تسمے کے آخر میں دھات یا ہڈی کے چھوٹے چھوٹے گولے سے بندھے ہوتے تھے تاکہ کوڑا لگتے وقت مجرم کو سخت اذیت پہنچے۔ چادر پر جو تصویر مرتسم ہوئی ہے اس پر موجود زخموں کے نشانات بتا رہے ہیں کہ یہ اس خصوصی رومی کوڑے کے نشانات ہیں۔

(۹) اس تصویر میں کندھے پر بھی زخم کا نشان موجود ہے یہ وہی نشان ہے جو یقینی طور پر اس وقت پیدا ہوا ہو گا جب حضرت مسیحؑ نے اپنی بھاری صلیب اٹھا کر کندھے پر رکھی ہو گی۔

(۱۰) تصویر میں پیشانی اور سر کی پچھلی طرف خون کی دھاریاں نظر آتی ہیں۔ یہ خون کانٹوں کے اس تاج سے بہا تھا جو صلیب پر چڑھانے سے قبل حضرت مسیحؑ کے سر پر رکھا گیا تھا۔

(۱۱) مقدس چادر پر مرتسم تصویر میں صاف نظر آ رہا ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کی تصویر ہے جس کے ہاتھوں میں کیلیں ٹھونکی گئیں تھیں کیونکہ چادر پر جسم کے ان دونوں حصوں (ہاتھوں) سے خون بہنے کی لکیریں صاف نظر آ رہی ہیں۔ یہ بھی دیکھا جا

سکتا ہے کہ دونوں بازو ۵۵ سے ۶۵ ڈگری کے زاویے سے پھیلے ہوئے ہیں۔ تصویر جس حیران کن حقیقت کا انکشاف کرتی ہے وہ یہ ہے کہ کیل حضرت مسیحؑ کے ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں نہیں بلکہ کلائیوں میں ٹھونکے گئے تھے جبکہ عام آرٹسٹ تصویر میں حضرت مسیحؑ کی ہتھیلیوں میں کیل گڑے ہوئے دکھاتے ہیں حالانکہ ایسا ممکن نہیں کہ ہتھیلیوں میں کیل ٹھونک کر جسم کو صلیب پر روکا جا سکے۔ چنانچہ فرانس کے ایک ممتاز سرجن ڈاکٹر بارڈر (Dr. Barder) نے تجربات سے ثابت کیا ہے کہ اگر چالیس کلو گرام وزنی آدمی کو بھی ہتھیلیوں میں کیل ٹھونک کر صلیب پر لٹکا دیا جائے تو بوجھ کی وجہ سے ہتھیلیاں پھٹ جائیں گی اور ہاتھ صلیب سے آزاد ہو جائیں گے کیونکہ ہتھیلی کے وسط سے لے کر انگلیوں کے درمیانی خلاء تک کہیں رکاوٹ نہیں جبکہ کلائی میں کیل ٹھونکنے کے بعد آگے روک آ جاتی ہے اس لئے صلیب پر چڑھانے کے بعد کیل ہتھیلیوں میں نہیں بلکہ کلائیوں میں ٹھونکے جاتے تھے۔

غور فرمائیے کیا کسی جعلی تصویر بنانے والے کی نگاہ اس باریکی تک جا سکتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ اب تک حضرت مسیحؑ کی جتنی تصویریں بنائی گئیں ان میں کلائیوں کی بجائے ہتھیلیوں کو کیلوں کے ساتھ جڑا ہوا دکھایا گیا ہے جبکہ اس چادر پر ثبت شدہ تصویر میں کیلوں کے زخم کلائیوں میں نظر آ رہے ہیں اس سے ثابت ہوا کہ یہ اصلی اور حقیقی تصویر ہے جو حضرت مسیحؑ کے جسم سے نکلنے والے پسینے بخارات اور چادر پر موجود محلول سے مل کر بن گئی اگر جعل ساز بناتا تو کیلوں کے زخم عام تصویر اور روش کے مطابق ہتھیلیوں پر دکھاتا۔

(۱۲) انجیل واضح الفاظ میں کہتی ہے کہ حضرت مسیحؑ کی ٹانگوں کی ہڈیاں نہیں توڑی گئی تھیں۔ (21)

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ اس چادر پر جو تصویر ثبت ہے اس پر کسی ایسی ضرب (چوٹ) کا ہلکا سا نشان بھی موجود نہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ حضرت مسیحؑ کی رانوں یا پنڈلیوں کی ہڈیاں توڑی گئی تھیں۔

(۱۳) اس تصویر کے اصلی اور قدرتی ہونے کا سب سے بڑا ثبوت وہ نشان ہے جو چادر پر پسلیوں کے قریب نظر آ رہا ہے یہ نشان جسم کے دائیں طرف پانچویں اور چھٹی پسلی کے درمیان دیکھا جا سکتا ہے یہ ساڑھے چار سینٹی میٹر سائز کا نشان ہے یہاں پر خون کافی مقدار میں بہتا ہوا نظر آتا ہے۔ کیا یہ حیران کن بات نہیں کہ صلیب سے اتارنے سے قبل ایک رومی سپاہی نے حضرت مسیحؑ کی پسلی میں نیزہ مارا تھا اور انجیل کہتی ہے کہ اس سے خون اور پانی بہہ نکلا تھا۔ (22)

چنانچہ خون کا بہت بڑا نشان اس چادر پر صاف نظر آ رہا ہے اس سے پوری طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ مقدس چادر پر جس شخصیت کی تصویر ثبت ہے وہ حضرت مسیحؑ کے سوائے اور کوئی نہیں ہو سکتا کیونکہ کسی اور شخصیت کے ساتھ یہ واقعات پیش نہیں آئے۔ کیا یہ غور طلب بات نہیں کہ اس تصویر میں حضرت مسیحؑ کے جسم کا مکمل عکس اور صلیب پر رونما ہونے والی تمام کیفیات منعکس ہو گئیں اور یہ سیدھی تصویر کی صورت میں نہیں بلکہ نیگیٹو کی صورت میں چادر پر ثبت ہیں۔ کیا انسانی ہاتھ سے یہ ممکن ہے؟

حوالہ جات

(1) یوحنا باب نمبر19 آیت نمبر38 تا نمبر40

(2) The Crucifixion By An Eye Witness P-74

(3) یوحنا باب نمبر20 آیت نمبر1 تا نمبر7

(4) The Bible (James Moffatt) Harper And Row, Publishers New York, S. John - 19, 38-40

(5) "Jesus Lived In India" By Holger Kersten P-149

(6) "Jesus Lived In India" By Holger Kersten P-149

(7) یوحنا باب نمبر19 آیت نمبر39 و 40

(8) Jesus Died In Kashmir By Andrea Faber Kaiser P-30, 31

(9) "Jesus Lived In India" By Holger Kersten P-145

(10) "Jesus Lived In India" By Holger Kersten P-145

(11) "Saga Of The Shroud Ended," By Earnesa Hauser., Published In "Readers Digest" Nov. 1989

(12) "Jesus Lived In India" By Holger Kersten. P-146

(13) "A Piece of Cloth: The Turin Shroud Investigated" By Rodney Hore Welling Barough, The Aquarian Press 1984.

(14) Saga Of The Shroud Ended "By Earnesa Hauser, Published In Readers Digest, Nov. 1989 A.D.

(15) "Science Magazine" No. 56 1989 Karachi

(15-A) The Shroud And The Controversy, By Kenneth E. Stevenson And Gary R. Habermas Publishers Thomas Nelson Nashville U.S.A. p.49 -1990

(15-B) The Shroud And The Controversy, P-55

(15-C) The Shroud And The Controversy, P-56

(15-D) The Shroud And The Controversy, P-55

(15-E) The Shroud And The Controversy, P-56

(15-F) The Shroud And The Controversy, P-55

(15-G) The Shroud And The Controversy, P-51

(15-H) The Shroud And The Controversy, P-56

(15-I) The Shroud And The Controversy, P-56

(15-J) The Shroud And The Controversy, P-53

(15-K) The Shroud And The Controversy, P-53

(15-L) The Shroud And The Controvorsy, P-58

(16) Saga Of The Shroud Ended By Earnesa Hauser, Published In Readers Digest." Nov. 1989 A.D. And Jesus Lived In India By Holger Kersten, P-133.

(17) Saga Of The Shroud Ended By Earnesa Hauser, Published In Readers Digest, Nov. 1989 A.D.

(18) "The Age Of The Shroud" Chapter of "Jesus Lived In India" P-133

(19) متی باب نمبر28 ایت نمبر10

(20) "The Shroud And The Controversy"

(21) یوحنا باب نمبر19 آیت نمبر34

(22) یوحنا باب نمبر19 آیت نمبر33، نمبر34

مسیحؑ کی پوشیدگی

وہ خدا کا نبی تھا مگر لوگوں کو منع کرتا تھا کہ کسی سے نہ کہنا کہ میں مسیح ہوں"۔ وہ دن کی روشنی میں سفر کرنے اور لوگوں سے ملنے جلنے سے بھی گریز کرتا تھا تاکہ لوگوں کو معلوم نہ ہو جائے کہ مسیح ابھی زندہ ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ صلیب سے زندہ بچ نکلا تھا اور یہودی اس کا تعاقب کر رہے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے اور انجیل بھی شہادت دیتی ہے کہ حضرت مسیحؑ پر ایک دور ایسا بھی آیا تھا جب آپؑ خود کو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھتے تھے۔ بھیس بدل کر سفر کرتے تھے۔ شاگردوں کو منع کرتے تھے کہ آپؑ کی نقل و حرکت کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتایا جائے۔ یہ سارے واقعات انجیل میں درج ہیں۔

شاگردوں کو ہدایت

مثال کے طور پر ایک روز حضرت مسیحؑ ایک پہاڑ پر سے اتر رہے تھے آپؑ کے پیچھے عقیدتمند بھی آ رہے تھے کہ نیچے پہنچ کر ایک کوڑھی قریب آیا اور آپؑ کے قدموں میں گر کر التجا کرنے لگا کہ اسے پاک و صاف کر دیا جائے۔ حضرت مسیحؑ نے اسے پاک و صاف کیا اور فرمایا کہ دیکھو اس واقعے کا کسی سے ذکر نہ کرنا، انجیل کے الفاظ یہ ہیں۔

خبردار کسی سے نہ کہنا۔" متی باب نمبر آیت نمبر

یعنی کسی کو خبر نہ ہو کہ یسوع نامی شخص زندہ ہے۔ وہ بیماروں کو دعا یا دوا) کے ذریعے سے شفا دیتا ہے اور فلاں مقام پر موجود ہے۔ ایک اور موقع پر دو روحانی نابیناؤں کو آپؑ نے بینائی عطا کی اور پھر انہیں ہدایت فرمائی کہ

(1) "خبردار کوئی اس بات کو نہ جانے" (متی باب نمبر۹ آیت نمبر۳۰)

پھر انجیل کہتی ہے کہ ایک عبادت خانے کے سردار کی بیٹی فوت ہو گئی آپؑ اس کے گھر تشریف لے گئے اور اسے دیکھ کر فرمایا کہ لڑکی مری نہیں بلکہ سوتی ہے (یعنی غشی یا سکتے کی حالت میں ہے) اس کے بعد اسے (دعا یا دوا کے ذریعے) تندرست کیا۔ اس واقعے کو بھی آپؑ نے پوشیدہ رکھنے کی ہدایت فرمائی چنانچہ انجیل میں ہے کہ:۔

(2) "پھر اس نے ان کو تاکید سے یہ حکم دیا کہ یہ کوئی نہ جانے" (مرقس باب نمبر۵ آیت نمبر۴۳)

اسی قسم کا ایک اور واقعہ پیش آیا جب حضرت مسیحؑ گلیلی نامی جھیل کے کنارے ٹھہرے ہوئے تھے کہ ایک بہرے کو جو ہکلا بھی تھا آپؑ کے پاس لایا گیا اس کے عزیزوں نے آپؑ سے درخواست کی کہ اس کی معذوری کو دور کر دیجئے حضرت مسیحؑ نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر آہ بھری (دعا کی) اس کے بعد اس کی معذوری دور ہو گئی پھر آپؑ نے لوگوں سے کہا کہ اس واقعے کا کسی سے ذکر نہ کرنا یعنی کسی کو نہ بتانا کہ یسوع فلاں جگہ مقیم ہے اور بیماروں کو (دعا کے ذریعے) صحت یاب کر رہا ہے۔ انجیل کے الفاظ یہ ہیں۔

(3) "اور اس نے ان کو حکم دیا کہ کسی سے نہ کہنا" (مرقس باب نمبر۷ آیت نمبر۳۵)

ایک اور موقع آیا جب حضرت مسیحؑ ایک پہاڑ پر تھے اور آپؑ کے حواریوں کو تازگی ایمان کے لئے کشفی نظارہ دکھایا گیا جس میں حضرت مسیحؑ کو نورانی پیکر میں تبدیل کر دیا گیا تو آپؑ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا کہ:۔

(4) "جو کچھ تم نے دیکھا کسی سے نہ کہنا"

(مرقس باب نمبر۹ آیت نمبر۹)

سفر کرتے ہوئے جب حضرت مسیحؑ "قیصریہ فلپی" نامی علاقے میں داخل ہوئے تو آپ نے اپنے ہم سفر حواریوں سے پوچھا کہ لوگ ابن آدم (یعنی مسیحؑ) کو کیا کہتے ہیں انہوں نے جواب دیا کہ بعض اسے (یعنی آپؑ کو) یوحنا بپتسمہ دینے والا کہتے ہیں، بعض "ایلیاہ" کا نام دیتے ہیں اور بعض لوگ یرمیاہ یا دوسرے نبیوں میں سے قرار دیتے ہیں۔ اس پر حضرت مسیحؑ نے دریافت کیا کہ مگر تم مجھے کیا کہتے ہو؟ شمعون پطرس نے جواب دیا کہ "تو زندہ خدا کا بیٹا مسیحؑ ہے۔" اس پر حضرت مسیحؑ نے پطرس حواری کی تعریف کی۔

اسے بشارات دیں اور حواریوں کو مخاطب کرتے ہوئے ہدایت فرمائی کہ:۔

(5) "کسی کو نہ بتانا کہ میں مسیحؑ ہوں" (متی باب نمبر۱۶ آیت نمبر۱۳)

یعنی کسی کو معلوم نہ ہونے پائے کہ مسیحؑ نامی یہ شخص ابھی تک زندہ ہے اور فلاں مقام پر موجود ہے یا فلاں علاقے میں سفر کر رہا ہے۔

تاریکی میں روشنی

انجیل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک دور ایسا بھی آیا جب آپؑ لوگوں سے دن کی روشنی میں ملنے سے گریز کرتے تھے تاکہ حکومت وقت اور آپؑ کے دشمن یہودیوں کو آپؑ کی قیام گاہ کا علم نہ ہو جائے چنانچہ انجیل کہتی ہے کہ:۔

(6) "شام کو جب سورج ڈوب گیا تو سب بیماروں کو اور ان کو جن میں بد روحیں تھیں اس کے پاس لائے" (مرقس باب نمبر۱ آیت نمبر۳۲)

یعنی دن میں بیماروں کو آپؑ کے پاس نہیں لایا جاتا تھا۔

اس مقام کے علاوہ انجیل کے بعض اور مقامات ایسے ہیں جن کے مطالعے سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جناب مسیحؑ زندگی کے ایک دور میں آپنے آپؑ کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے چنانچہ انجیل کے اس مقام سے تھوڑا سے آگے بڑھ کر ایک اور روایت ملتی ہے جس کی رو سے ایک کوڑھی نے آپؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ اسے پاک صاف کر دیا جائے حضرت مسیحؑ نے اس کی درخواست قبول فرمالی۔ اسے پاک صاف کرنے کے بعد رخصت کر دیا اور ہدایت فرمائی کہ اس واقعے کا کسی سے ذکر نہ کرنا انجیل کے الفاظ یہ ہیں:۔

(7) "اور اس سے کہا کہ خبردار کسی سے کچھ نہ کہنا" (مرقس باب ا آیت نمبر۴۴)

مگر وہ شخص جذبات عقیدت سے اس قدر مغلوب ہو گیا کہ حضرت مسیحؑ کی اس تاکید کو فراموش کر بیٹھا اور انجیل کے بیان کے مطابق:۔

(8) "باہر جا کر بہت چرچا کرنے لگا اور اس بات کو ایسا مشہور کیا کہ یسوع پھر شہر میں ظاہرا" داخل نہ ہو سکا بلکہ باہر ویران مقاموں میں رہا" (مرقس باب نمبرا آیت نمبر۴۵)

ویرانوں میں قیام

اس آخری روایت نے سارا مسئلہ حل کر دیا اور ثابت کر دیا کہ زندگی کے ایک دور میں حضرت مسیحؑ اپنے آپ کو لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھتے تھے اور اگر آپؑ کو معلوم ہو جاتا تھا کہ کسی مقام پر آپؑ کی موجودگی کا لوگوں کو علم ہو گیا ہے تو پھر آپؑ اسے ترک کر دیتے تھے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپؑ نے غیر آباد اور ویران مقامات کو اپنا مسکن بنا لیا تھا تاکہ دشمن کی گرفت میں نہ آجائیں۔ آگے چل کر انجیل کے اسی نسخے (مرقس) میں ایک روایت ہے کہ حضرت مسیحؑ نے اپنے شاگردوں کو ویرانے میں بھیج دیا اور آپؑ خود بھی اس ویرانے میں منتقل ہو گئے اس مقام کے ویران اور غیر آباد ہونے کا ثبوت خود انجیل فراہم کرتی ہے چنانچہ کتاب مقدس بیان کرتی ہے کہ :-

(9) "جب بہت دن ڈھل گیا تو اس کے شاگرد اس کے پاس آکر کہنے لگے کہ یہ جگہ ویران ہے اور دن بہت ڈھل گیا ہے ان کو (یعنی عقیدت مندوں کو) رخصت کر تا کہ چاروں طرف کی بستیوں اور گاؤں میں جا کر اپنے لئے کچھ کھانے کو مول لیں" (مرقس باب نمبر۶ آیت نمبر۳۵)

یعنی اس مقام پر کوئی آبادی نہیں تھی حتیٰ کہ کھانے پینے کی معمولی چیز بھی دستیاب نہ ہوتی تھی اس لئے حضرت مسیحؑ کے شاگرد قریب کی بستیوں میں جا کر اشیاء خور و نوش خریدنا چاہتے تھے اور کہہ رہے تھے کہ "یہ جگہ ویران ہے۔"

یہ بہت غور کرنے کا مقام ہے کہ حضرت مسیحؑ اپنی نقل و حرکت کو کیوں پوشیدہ رکھتے تھے، اپنے معجزات کی تشہیر سے لوگوں کو کیوں منع فرماتے تھے حالانکہ انبیاء کے معجزات تو ان کی صداقت کا بہت بڑا نشان ہوتے ہیں وہ ان پر خدا کا انعام ہوتے ہیں انبیاء انہیں چھپاتے نہیں بلکہ ظاہر کرتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں پر ان کی صداقت آشکار ہو سکے ان کا پیغام اس ذریعے سے لوگوں تک پہنچ سکے مگر عجیب بات ہے کہ قبولیت دعا کے نتیجے میں جب حضرت مسیحؑ سے کوئی نشان ظاہر ہوتا تھا تو آپؑ اپنے عقیدت مندوں کو اس پر پردہ ڈالنے کی ہدایت فرماتے تھے اور تاکید کرتے تھے کہ اس کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔

اس کی ایک ہی وجہ تھی کہ اس زمانے میں جناب مسیحؑ کے سوائے اور کوئی نشان نمائی کی قدرت و صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ جب یہ خبر مشہور ہوتی کہ فلاں بستی میں ایک شخص سے فلاں نشان ظاہر ہوا ہے تو یہودی اور رومی حکومت کے کارندے فوراً اس بستی کا رخ کرتے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ مسیحؑ کے سوائے کوئی اور شخص نہیں ہو سکتا جسے انہوں نے صلیب پر ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی مگر جو صلیب سے زندہ بچ نکلا تھا۔ اس طرح جناب مسیحؑ کا آبادیوں سے دور رہنا، پہاڑوں اور ویرانوں میں زندگی گزارنا، دن کی روشنی میں زیادہ لوگوں سے ملنے جلنے سے دامن کش رہنا، اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کو معجزات و نشانات کی تشہیر سے روکنا اسی وجہ سے تھا کہ دشمن کو معلوم نہ ہونے پائے کہ آپ کہاں ہیں؟ ورنہ اس سے قبل آپؑ کھلم کھلا تبلیغ کرتے تھے، بپتسمہ دیتے تھے، عبادت خانوں میں جاتے تھے اور اپنا سارا وقت لوگوں کے درمیان آبادیوں میں گزارتے تھے۔

تبدیلی ہیئت

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ایک دور ایسا آتا ہے (اور وہ یہی دور ہے) جب حضرت مسیحؑ بھیس بدل کر سفر کرتے ہیں جسے بعض سادہ لوح مسلمان علما نے شکل تبدیل کرنے کا معجزہ قرار دے دیا۔ انجیل کے کئی مقامات پر ایسے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر جب حضرت مسیحؑ اپنی عارضی قبر سے چلے جاتے ہیں اور اس کا ہر طرف چرچا ہوتا ہے تو ایک روز یروشلم سے سات میل دور "اماؤس" نامی گاؤں کی طرف جاتے ہوئے دو آدمیوں کے درمیان اس واقعے کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ انجیل کہتی ہے کہ :-

(10) "تو ایسا ہوا کہ یسوع آپ نزدیک آکر ان کے ساتھ ہو لیا لیکن ان کی آنکھیں بند کی گئیں تھیں کہ اس کو نہ پہچانیں ○ اس (یسوع) نے ان سے کہا یہ کیا باتیں ہیں جو تم چلتے چلتے آپس میں کرتے ہو؟ وہ غمگین سے کھڑے ہو گئے پھر ایک نے جس کا نام "کلیپاس" تھا جواب میں اس سے کہا کیا تو یروشلم میں اکیلا مسافر ہے جو نہیں جانتا کہ ان دنوں اس میں کیا ہوا ہے؟ اس (یسوع) نے ان سے کہا کیا ہوا؟ (10) انہوں نے اس سے

کہا:-

"یسوع ناصری کا ماجرا۔" (لوقا باب نمبر ۲۴ آیت نمبر ۱۳ تا ۱۹)

اس روایت کی رو سے جناب مسیحؑ ان دو آدمیوں کے ساتھ شریک سفر ہو گئے مگر دونوں میں سے کوئی بھی آپؑ کو نہ پہچان سکا اور انہیں ایک ناواقف مسافر سمجھ کر تعجب کا اظہار کیا کہ یسوع کے ساتھ اتنا بڑا واقعہ پیش آگیا اور اس شخص کو خبر تک نہیں حالانکہ حضرت مسیحؑ ان دونوں کے لئے اجنبی نہیں تھے۔ آپؑ کی شکل و صورت سے وہ آپؑ کو پہچانتے تھے مگر اس کے باوجود وہ آپؑ کو نہ پہچان پائے اس سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے بھیس بدل رکھا تھا کیونکہ اسی روایت میں آتا ہے کہ جب حضرت مسیحؑ ان دونوں کی دعوت پر ایک مکان میں گئے اور اپنے آپ کو ان پر ظاہر کیا تو:-

(11) "انہوں نے اس (یسوع) کو پہچان لیا اور پھر وہ ان کی نظروں سے غائب ہو گیا۔" (لوقا باب نمبر ۲۴ آیت نمبر ۳۱)

اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ اپنے آپؑ کو ظاہر کرنے کے بعد حضرت مسیحؑ وہاں سے چلے گئے جسے نظروں سے غائب ہونا کہا گیا ہے تاکہ لوگوں کو اس علاقے میں آپؑ کی موجودگی کا علم نہ ہو جائے۔

باغبان کے بھیس میں

اس قسم کی ایک اور روایت حضرت مسیحؑ کے سب سے محبوب صحابی یوحنا حواری کی ہے جو انجیل میں درج ہے۔ اس روایت کے مطابق ایک روز مریم (مگدلینی) نامی ایک خاتون اس غار نما قبر کے قریب کھڑی رو رہی تھی جس میں عارضی طور پر آپؑ کو رکھا گیا تھا کہ اتنے میں آپؑ تشریف لے آئے اور اس خاتون سے پوچھا کہ اے عورت تو کیوں روتی ہے؟ کس کو ڈھونڈتی ہے؟ انجیل کہتی ہے کہ:-

(12) اس عورت نے باغبان سمجھ کر اس (یسوع) سے کہا میاں! اگر تو نے اس کو یہاں سے اٹھایا ہو تو مجھے بتا دے کہ اسے کہاں رکھا ہے تاکہ میں اسے لے جاؤں۔" یوحنا

باب نمبر ۲۰ آیت نمبر ۱۵)

اس روایت سے تو قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ حضرت مسیحؑ اس دور میں بھیس بدل کر سفر کرتے تھے کیونکہ مریم نامی یہ خاتون حضرت مسیحؑ کی شاگردہ تھیں آپؑ کے ہاتھ پر بپتسمہ لے کر مسیحیت میں داخل ہوئی تھیں آپؑ کو بخوبی جانتی اور پہچانتی تھیں مگر اس ملاقات میں وہ آپؑ کو نہ پہچان سکیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جناب مسیحؑ نے باغبانوں کا مخصوص لباس پہنا ہوا تھا اس لئے انہوں نے آپؑ کو (بقول انجیل) "باغبان سمجھ کر" دریافت کیا کہ اے میاں! اگر تو نے اسے (مسیح کو) یہاں سے اٹھایا ہے تو بتا دے؟ پھر جب حضرت مسیحؑ نے اس خاتون کو "مریم!" کہہ کر مخاطب کیا تو اس نے آپؑ کو پہچان لیا اور عبرانی زبان میں:-

(13) "ربونی!" (اے استاد) کہہ کر ان کے پیر پکڑ لئے (یوحنا باب ۳۰ آیت ۱۶)

گویا آواز اور لہجے سے اور پھر اپنا نام لے کر پکارنے کے انداز سے اس خاتون نے پہچانا کہ یہ حضرت مسیحؑ ہیں اگر آپؑ نے بھیس بدلا ہوا نہ ہوتا تو مریم جیسی خاتون آپؑ کو پہچاننے میں کبھی دشواری محسوس نہ کرتیں جو آپؑ کے چند قریب ترین اور عزیز ترین شاگردوں میں سے تھیں۔

یہاں بجا طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس دور میں حضرت مسیحؑ کو بھیس بدلنے اور ہیئت تبدیل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا ایک ہی جواب ہے کہ صلیب سے بچ نکلنے کے بعد آپؑ کو اپنی گرفتاری کا دوبارہ خطرہ تھا اس خطرے کے پیش نظر آپؑ آبادیوں سے دور پہاڑوں اور ویرانوں میں سفر کرتے تھے۔ اپنے آپؑ کو روپوش رکھنے کے لئے شاگردوں اور عقیدتمندوں کو تاکید فرماتے تھے کہ ان کے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہنا اور اسی خطرے کے پیش نظر آپؑ بھیس بدل کر سفر کرتے تھے۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا یہاں تک کہ فلسطین سے نکل کر آپؑ نے اپنا نام بھی تبدیل کر لیا تھا اور یوز آسف کے نام سے باقی سفر طے کیا تھا۔ اگر آپؑ کے ساتھ واقعہ صلیب پیش نہ آچکا ہوتا تو کیا ضرورت تھی کہ آپؑ خود کو پوشیدہ رکھتے اور بھیس بدل کر سفر کرتے جبکہ اس سے قبل آپؑ یروشلم میں آزادانہ گھومتے پھرتے تھے، سارے فلسطین کے تبلیغی دورے کرتے

تھے حتیٰ کہ بیت المقدس میں یہودی علماء سے بحث و مناظرہ کرتے تھے لیکن اب ایسا وقت آگیا تھا کہ دشمنوں نے آپؑ پر زمین تنگ کردی تھی اور آپؑ کو سر چھپانے کو بھی جگہ نہ ملتی تھی چنانچہ ایک موقع پر آپؑ نے بہت درد و کرب سے فرمایا کہ :-

"لومڑیوں کے بھٹ ہوتے ہیں اور ہوا کے پرندوں کے گھونسلے مگر ابن آدم (یعنی مسیح) کے لئے سر رکھنے کی جگہ نہیں۔" (متی باب ۸ آیت ۲)

حوالہ جات

(1) متی، باب نمبر۹ آیت نمبر۰

(2) مرقس، باب نمبر۵ آیت نمبر۳

(3) مرقس، باب نمبر۷ آیت نمبر۵

(4) مرقس، باب نمبر۹ آیت نمبر۹

(5) متی، باب نمبر۶ آیت نمبر۳

(6) مرقس، باب نمبر۱ آیت نمبر۲

(7) مرقس، باب نمبر۱ آیت نمبر۴

(8) مرقس، باب نمبر۱ آیت نمبر۵

(9) مرقس، باب نمبر۶ آیت نمبر۵

(10) لوقا، باب نمبر۴ آیت نمبر۳

(11) لوقا، باب نمبر۴ آیت نمبر۱

(12) یوحنا، باب نمبر۰ آیت نمبر۵

(13) یوحنا، باب نمبر۰ آیت نمبر۶

مشرق میں اسرائیلی بستیاں

یوں دکھائی دیتا ہے کہ وہ جدھر بھی جاتا ہے اور جو بھی راستہ اختیار کرتا ہے اپنی قوم کے لوگوں کو ہر جگہ آباد پاتا ہے حتیٰ کہ چین اور ہندوستان بھی ان سے خالی نہیں۔ (1)

آپ کو معلوم ہے یہ کون ہے کہ جہاں جاتا ہے اپنی قوم کے لوگوں کی بستیوں کی بستیاں آباد پاتا ہے؟ یہ حضرت مسیحؑ ناصری ہیں جنہوں نے ہندوستان اور چین تک سفر کیا اور ان ممالک میں اپنی قوم (بنی اسرائیل) کو ہر جگہ آباد پایا ۔کوئی ملک اور کوئی خطہ ان سے خالی نہیں تھا۔ ان اسرائیلی آباد کاروں میں دو قسم کے لوگ تھے ایک وہ جو تجارت وغیرہ کے سلسلے میں نقل وطن کر کے ممالک غیر میں مقیم ہوئے اور پھر وہیں کے ہو گئے۔ بیشتر لوگوں کے لئے شاید یہ اطلاع تعجب کا باعث ہو کہ ان بنی اسرائیل کی آباد کاری کا سلسلہ حضرت موسیٰؑ کی ہجرتِ مصر (غرقابیٔ فرعون) سے بھی پہلے شروع ہو چکا تھا۔ دوسرا گروہ ان اسرائیلیوں کا تھا جو دشمنوں کے حملوں کا نشانہ بنے اور ۷۲۱ قبل مسیحؑ سے لے کر ۵۸۷ قبل مسیحؑ تک فلسطین سے جبراً بیدخل کئے گئے۔ پہلے آشوریوں نے اور پھر عراق کے بادشاہ نبوکدنذر (بخت نصر) نے حملہ کر کے بنی اسرائیل کی عظیم الشان سلطنت اور ان کے پرشوکت دارالسلطنت یروشلم کو خاک میں ملا دیا حتیٰ کہ بیت المقدس کو بھی تباہ کر کے کھنڈر بنا دیا اور ہزاروں ہزار اسرائیلیوں کو گرفتار کر کے عراق و ایران میں منتشر کر دیا جہاں سے ان کے قافلے وقتاً فوقتاً نقل مکانی کر کے افغانستان، ہندوستان اور چین کے بعض علاقوں تک جا بسے۔

حال ہی میں جو نئی تحقیقات سامنے آئی ہیں ان کی روشنی میں اب تو مغربی مورخین بھی دبے الفاظ میں نہیں بلکہ برملا کہہ رہے ہیں کہ بہت سے ممتاز افغان خاندانوں کے لوگ اسرائیلی بادشاہ ساؤل کی اولاد ہیں کیونکہ یہ افغانوں کا دعویٰ ہے۔ یہ وہی ساؤل ہے

جس کی حکومت بعد میں حضرت داؤدؑ کے قبضہ میں آئی (اور جس کا عہد فرعون کے زمانے سے متصل تھا) صرف یہی نہیں کہ افغان اکابر فرعون کے زمانے سے خود کو بنی اسرائیل سے منسوب کرتے تھے بلکہ ان کا دعویٰ ہے کہ فرعون کی غرقابی سے بہت پہلے ان کے اسلاف افغانستان میں آباد تھے۔۔۔(2)

افغانستان میں اسرائیلی بستیاں

مورخ ڈاکٹر گاڈبے (GODBEY) نے لکھا "ہے کہ افغانستان کے شمال مشرقی علاقے "کوہِ غور" میں جو افغان آباد ہیں وہ دراصل مشہور اسرائیلی سردار مسلم بن اسرائیل کی اولاد ہیں جنہیں ایرانی حکمرانوں نے ہندوستان سے آنے والے تجارتی قافلوں کی حفاظت کے لئے وہاں آباد کیا تھا۔۔۔(3)

ایک اور مغربی مصنف و محقق سر اے برنس (SIR.A.BURNES) نے افغانوں کی تاریخ کے بارے میں تحقیق کرنے کے بعد یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ یہ لوگ کس نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور کہاں سے آکر افغانستان میں آباد ہوئے، آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ (خود) افغانوں کی روایت کے مطابق بابل (عراق) کا ایک بادشاہ ان کے اکابر کو ارضِ مقدس (فلسطین) سے (گرفتار کرکے) لایا اور کابل کے شمال مغرب میں "غور" (GHORE) کے مقام پر بسا دیا پھر عرب کے ایک سردار خالد کے ہاتھ پر بیعت کر کے یہ لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ مورخ برنس کہتا ہے کہ اگرچہ اس روایت کی شہادت نہیں ملتی تاہم اس علاقے میں سفر کرنے والے سیاح اس بات پر متفق ہیں کہ یہ لوگ اپنی ہمسایہ قوموں سے بہت مختلف ہیں اور یہ کسی مشترکہ نسب سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض سیاح کہتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے طور طریقوں اور خدوخال کے لحاظ سے یہودیوں سے بہت مشابہ ہیں، مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں، اپنی علیحدہ بستیوں میں رہتے ہیں اور دوسری قوم کے لوگوں میں شمولیت سے اجتناب کرتے ہیں۔۔ (4)

بنی اسرائیل بخارا میں

ایک اور بڑا مغربی مورخ جارج مور (GEORGE MOOR) لکھتا ہے کہ:۔

"یہ رائے قائم کرنے کی بہت سی معقول وجوہ موجود ہیں کہ افغانستان حتیٰ کہ بخارا کے بہت سے باشندے اسرائیلی نسل سے تعلق رکھتے ہیں ان کے چہرے اسرائیلی خاندانوں سے بہت مشابہ ہوتے ہیں۔ خود ایک یہودی مبلغ ڈاکٹر وولف (DR. WOLFF) کو کہنا پڑا کہ:۔

"میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ یوسف زئی علاقے اور علاقہ خیبر میں آباد قبائل کے افراد اپنے چہرے مہرے کے لحاظ سے بالکل یہودیوں سے مشابہ تھے۔"

اسی طرح ایک اور مغربی مورخ مور کروفٹ (MOOR CROFT) کا مشاہدہ ہے کہ:۔

"علاقہ خیبر کے لوگ دراز قامت ہوتے ہیں اور ان کے چہروں کے نقوش بالکل یہودیوں جیسے ہوتے ہیں۔"

اس صریح مشابہت سے قطع نظر چند اور پہلو بھی ہیں جو اس خیال کو تقویت دیتے ہیں کہ افغانستان کے لوگ اسرائیلی نسل سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً:۔

(۱) زمانہ قدیم سے خود افغان لوگ یہ دعویٰ کرتے چلے آ رہے ہیں کہ ہم اسرائیلی ہیں۔

(۲) ان قبائل کے نام بھی ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اسرائیلی ہیں کیونکہ یہ قریب قریب وہی نام ہیں جو بنی اسرائیل میں رائج تھے۔

(۳) افغانستان کے مقامات اور افراد کے نام بھی عبرانی ہیں جو اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ لوگ ضرور بنی اسرائیل سے گہرا تعلق رکھتے ہیں (غور طلب بات یہ ہے کہ) یہ نام انہوں نے قبول اسلام سے پہلے کے زمانے میں اختیار کئے تھے۔

(۴) اس حقیقت میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ لوگ کسی دور دراز علاقے سے نقل مکانی کر کے "غور" (GHORE) کے پہاڑوں میں آباد ہوئے تھے اور یہ بھی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ "غور" (GHORE) کی شہزادی افغانوں کے قبیلے "سور" سے تعلق رکھتی تھی اور اس شاہی خاندان کو زمانہ قدیم سے گیارہویں صدی عیسوی تک بڑی شان و شوکت حاصل رہی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے ان

لوگوں نے کوہ سلیمان کے علاقوں پر قبضہ کیا جن میں افغانستان کے تمام جنوبی پہاڑ شامل
تھے۔

(۵) مغرب کے دو فاضل محققوں ڈاکٹر گارے (DR.GAREY) اور ڈاکٹر مار شمین
(DR. MARSHMAN) نے افغانوں اور بنی اسرائیل میں ایک اور قدر مشترک
تلاش کرنے کے بعد ثابت کیا ہے کہ دراصل یہ دونوں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے
ہیں۔ یہ دونوں فاضل محقق کہتے ہیں کہ پشتو زبان کی جڑیں دوسری زبانوں کے مقابلے میں
عبرانی زبان میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ یعنی پشتو زبان کے بیشتر الفاظ عبرانی زبان سے آئے
ہیں اور پشتو زبان کی اصل عبرانی زبان ہے جو بنی اسرائیل کی زبان تھی --(5)
یہ دعویٰ اور تحقیق صرف مغربی مورخوں اور محققوں ہی کی نہیں ہے بلکہ خود بعض
پختون مورخ اور دانشور بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان کی مادری زبان پشتو دراصل عبرانی
زبان سے نکلی ہے چنانچہ مشہور پختون مورخ اور "تاریخ خورشید جہاں" کے مصنف شیر
محمد خان جو بہت ہی کٹر افغان، بلکہ قوم پرست تھے لکھتے ہیں کہ
پشتو زبان کی جڑیں عبرانی لغت میں ملتی ہیں--(6)
گویا بنیادی طور پر دونوں ایک ہی زبان بولا کرتے تھے ایک ہی خطے کے رہنے والے
تھے کہ ہزاروں سال گزر جانے کے باوجود آج بھی ان کی زبان پر عبرانی کی چھاپ موجود
ہے۔

امیر دوست محمد خان کی رائے

کسی قوم کی اصلیت کے بارے میں اس کے اکابر کی رائے بھی بہت قدر و قیمت
رکھتی ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے ہمیں اس رائے پر بھی غور کرنا ہو گا جو والئی افغانستان امیر
دوست محمد خان (مرحوم) نے ظاہر کی تھی یہ ۱۸۳۷ء کا ذکر ہے جب حکومت برطانیہ نے
سر الیگزینڈر برونس (SIR ALEXANDER BRUNES) کو اپنا ایلچی بنا کر افغانستان
بھیجا۔ الیگزینڈر برونس کچھ دن کابل میں امیر دوست محمد خاں والئی افغانستان کے مہمان
رہے۔ ایک روز انھوں نے شاہ کابل سے دریافت کیا کہ کیا افغان بنی اسرائیل سے تعلق
رکھتے ہیں؟ اس کے جواب میں امیر دوست محمد خان نے کہا کہ بے شک ان کی قوم کے

لوگ اسرائیلی ہیں لیکن وہ اس نظریئے کو مسترد کرتے ہیں کہ افغان (مذہبا") یہودی ہیں
بلکہ وہ یہودی قوم سے نفرت کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ ان کا یہ دعویٰ کہ افغان بنی
اسرائیلی ہیں محض روایات پر مبنی نہیں ہے بلکہ ان کے پاس ایک قدیم دستاویز بھی موجود
ہے جس کا نام "مجمع الانساب" ہے--(7)
خود ہمارے زمانے کے ایک ممتاز مورخ جو خود بھی افغان اور پختون تھے اپنی تحقیقی
کتاب میں لکھتے ہیں کہ :۔
"اسلام سے قبل افغان حضرت موسیٰؑ کی تورات پڑھتے تھے"--(8)
اگر افغان بنی اسرائیلی نہ ہوتے اور حضرت موسیٰؑ پر ایمان نہ رکھتے تو انہیں تورات
کو زیر تلاوت رکھنے کی کیا ضرورت تھی، یہ ان کے اسرائیلی الاصل ہونے کی بہت بڑی
دلیل ہے۔
اب آخر میں افغانوں کے اسرائیلی ہونے کی ایسی شہادت جسے کوئی معقول شخص رد
کر ہی نہیں سکتا؟ یہ قبروں کی کچھ الواح ہیں جو افغانستان کے خطۂ مردم خیز "غور" سے
دریافت ہوئی ہیں۔ یہ الواح عبرانی زبان میں ہیں، ان پر بائبل کی عبارات کے چھوٹے
چھوٹے ٹکڑے بحروف عبرانی درج ہیں۔ اس شہادت کی تفصیل "جرنل ایسٹ اینڈ ویسٹ
" دسمبر ۱۹۶۲ء اور دسمبر ۱۹۶۳ء میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ جرنل روما سے شائع ہوتا ہے۔
کہا جا سکتا ہے کہ فلاں کتاب میں غلط واقعہ درج ہے فلاں مورخ نے جانب داری
سے کام لیا ہے اس لئے ہم ان شہادتوں کو نہیں مانتے لیکن کتبے تو سازشیں نہیں کرتے؟
لوح مزار تو غلط بیانی نہیں کرتی؟ افغانستان کے مقام "غور" سے ایسی الواح کا برآمد ہونا
جو عبرانی زبان میں ہیں اس امر کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ اس علاقے میں بنی اسرائیل
آباد تھے یہ انہی کی قبروں کے کتبے ہیں۔ اگر یہ لوگ اسرائیلی نہیں تھے تو ان کی قبروں پر
اسرائیلی پیغمبروں کی تعلیمات کے اقتباسات وہ بھی عبرانی زبان میں کیوں درج ہیں۔
یہاں ہمیں ایک بہت بڑی حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ افغان شاید
دنیا کی سب سے زیادہ انتہا پسند قوم ہے۔ یہ لوگ اپنے نظریات میں بہت متشدد اور کٹر
ہوتے ہیں، لچک نام کی کوئی چیز ان میں نہیں پائی جاتی جس سے محبت کرتے ہیں ٹوٹ کر

محبت کرتے ہیں اور جس سے نفرت کرتے ہیں بلا کی نفرت کرتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ
افغان مذہبی لحاظ سے یہودیوں کے شدید دشمن ہیں آخر اس کی کوئی تو وجہ ہے کہ جس قوم
سے وہ نفرت کرتے ہیں نسلی لحاظ سے اپنے آپ کو اسی کا حصہ بتاتے ہیں۔ اس سے ایک
ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ ایک حقیقت ہے جس کا انکار کرنا صریح بے ایمانی
ہے کہ "افغان حضرت یعقوبؑ کی اولاد اور اسرائیلی النسل ہیں" اس لئے یہودیوں سے
مذہبی لحاظ سے نفرت کرنے کے باوجود ان کا خود کو اسرائیلی قرار دینا ایک صداقت کا اقرار
ہے۔

چینی یہودی

تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ بنی اسرائیل بہت مہم جو قوم تھی، اس قوم کے افراد
حالات سے شکست مشکل ہی سے قبول کرتے تھے اور ان کی جدوجہد کسی نہ کسی شکل میں
جاری رہتی تھی۔ ان کے قافلے ایک بستی سے دوسری بستی کی طرف رواں دواں رہتے
تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایشیاء کا شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جہاں ان کی بستیاں نہ پائی جاتی
ہوں برصغیر کے علاوہ کاشغر، بخارا، تبت، اور چین میں ہمیں بنی اسرائیل کے آثار آج
بھی ملتے ہیں چنانچہ مشہور سیاح مسٹر برنیئر (BERNIER) نے اپنے سفر نامے
(TRAVAL IN THE MOGHAL EMPIRE) میں لکھا ہے کہ:۔

"غالباً" (اسرائیلی) قوم کے لوگ (چین کے علاقے) پیکن میں بھی پائے جاتے ہیں
یہ لوگ حضرت موسیٰؑ کے مذہب پر عمل کرتے ہیں اور تورات نیز اس سلسلے کی بعض دیگر
کتب ان کے زیر مطالعہ رہتی ہیں"۔۔(9)

برصغیر میں اسرائیلی آبادیاں

چین کے بعد برصغیر پاک و ہند، دوسرا ملک ہے جس میں بنی اسرائیل کی قدیم
آبادیوں کی نشاندہی ہوتی ہے چنانچہ حال ہی میں ایران سے کچھ کتبے ملے ہیں یہ کتبے
ساسانی دور حکومت سے تعلق رکھتے ہیں ان کا زمانہ ۲۷۵ء ہے۔ مدت تک ان کتبوں کی
زبان پڑھی نہیں جا سکی۔ ۱۹۵۳ء میں ایک اور کتبے کی مدد سے جو دو زبانوں میں تھا یہ کتبے

پڑھ لئے گئے اور دنیا کو بعض حقائق کا پہلی بار علم ہوا۔ ان کتبوں کے مطابق ۲۷۵ء میں
ایران کی ساسانی سلطنت دریائے فرات سے لے کر شمال میں دریائے سندھ تک پھیلی
ہوئی تھی اور صوبہ سرحد و پنجاب کے بعض مغربی علاقے، سندھ کے مغربی علاقے اور
بلوچستان یہ سب ایران کی ساسانی سلطنت کا حصہ تھے۔ ان کتبوں میں درج عبارت کی رو
سے سلطنت کا مذہب زرتشتی تھا، اس کے بعد سب سے بڑا مذہب یہودی تھا اس مذہب
کے ماننے والے ہندوستان کے شمال مغرب میں بکثرت آباد تھے۔ دوسرے نمبر پر بدھ اور
تیسرے نمبر پر برہمنی مذہب کے ماننے والے شمار کئے گئے تھے۔ چوتھا نمبر مذہب ناصرہ کو دیا
گیا تھا، یعنی نصاریٰ۔ نصاریٰ کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک وہ جو قدیم زمانے
سے ایران میں آباد تھے اور حضرت مسیحؑ کو قبول کر چکے تھے۔ دوسرے وہ نصاریٰ جو
انطاکیہ سے پکڑ کر لائے گئے تھے چونکہ وہ یونانی عیسائی قرار دیئے جاتے تھے اس لئے
انہیں کلیچین (کرسچین) لکھا گیا ہے۔۔(10)

اس طرح یہ کتبے اس امر کی سب سے بڑی شہادت ہیں کہ ایران کے علاوہ ہندوستان
کے شمال مغرب میں جہاں بدھوں اور برہمنوں کی بہت بڑی بڑی آبادیاں تھیں ان سے
متصل بنو اسرائیل (یہودی) اس کثرت سے آباد تھے کہ زرتشتی مذہب کے ماننے والوں
کے بعد تعداد کے لحاظ سے انہیں سارے مذاہب کے ماننے والوں پر برتری حاصل تھی۔

ٹیکسلا میں اسرائیلی آثار

موجودہ صوبہ سرحد سے تھوڑا سا مشرق کی طرف اور سفر کیجئے، ایک تاریخی شہر ٹیکسلا
آئے گا، پرانا شہر تو معدوم ہو چکا ہے اس کے آثار ہی باقی رہ گئے ہیں۔ یہ شہر بدھ تہذیب
کا مرکز ہونے کے علاوہ مدت دراز تک ہندوستان کے شمال مغربی حصے کا دارالسلطنت رہا
ہے۔ یہاں سے اب ایسے آثار ملے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس علاقے میں بنی
اسرائیل کا بہت بڑے پیمانے پر عمل دخل تھا اور وہ یہاں خاصی بڑی تعداد میں آباد تھے
چنانچہ ایک بہت بڑے اسکالر اور ماہر آثار قدیمہ سر جان مارشل کو ٹیکسلا میں ارامی زبان
کے کتبے ملے تھے جو پانچویں صدی قبل مسیحؑ کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔۔(11)

گویا ٹیکسلا میں شامی بنو اسرائیل اس وقت بھی آباد تھے جب حضرت مسیحؑ ناصری پیدا

بھی نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کی ولادت و بعثت میں ابھی پانچ سو سال باقی تھے۔

بمبئی کے کالے یہودی

جنوبی ہند کے شہر مدراس (میلاپور) میں مسیحی مبلغ اعظم اور حضرت مسیحؑ کے حواری جناب توماؑ کی آخری آرام گاہ تھی ان کی یاد میں وہاں ایک عظیم الشان چرچ بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ مدتوں تک یہ مسئلہ لاینحل رہا کہ جناب توما مدراس کیوں گئے تھے جب کہ وہ حضرت مسیحؑ کے مبلغ تھے اور حضرت مسیحؑ کو صرف بنی اسرائیل کی طرف بھیجا گیا تھا۔ کچھ مدت قبل ایسے شواہد سامنے آئے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جنوبی ہند میں بھی بنی اسرائیل آباد تھے جنہیں مورخ کالے یہودی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ جناب توما انہی کو تبلیغ کرنے مدراس گئے تھے۔ چنانچہ ایک ممتاز مغربی محقق ڈاکٹر ایلن ایچ گاڈ بے (DR. ALLEN. H. GODBEY) کی تحقیق کے مطابق ہندوستان میں بمبئی اور کوچن کے علاقوں میں جو کالے یہودی پائے جاتے ہیں انہی کے کچھ گروہ ہندوستان کے مغربی ساحل پر بھی آباد ہیں اور زمانہ قبل مسیح سے آباد ہیں-- (12)

گویا حضرت مسیحؑ کی بعثت سے بہت پہلے ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں یہودیوں کی بستیاں موجود تھیں جنہیں مورخین کالے یہودیوں کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

ایک اور فاضل مورخ اور اسرائیلی تاریخ کے عالم پروفیسر گریٹز (PROF:GRATEZ) نے اپنی فاضلانہ تحقیق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بمبئی اور کوچن کے درمیانی علاقوں اور سری لنکا میں ایسے لوگ آباد ہیں جو خود کو اسرائیل کی اولاد کہتے ہیں۔ ان کے دعوے کے مطابق جس وقت یروشلم کو دوسری بار تباہ کیا گیا تو ان کے آباؤ اجداد نے اپنے وطن کو خدا حافظ کہا اور ۲۸۰ قبل مسیح کے لگ بھگ اس علاقے (جنوبی ہند اور سری لنکا) میں آ بسے۔ کچھ لوگ اس کے بعد یعنی ۱۷۵ قبل مسیح میں شمالی ہند کے راستے سے آ کر جنوبی ہند میں آباد ہوئے--(12-A)

مالا بار میں یہودی

جدید تحقیق کی روشنی میں اب ایسے شواہد منظر عام پر آ رہے ہیں جن سے ظاہر ہوتا

ہے کہ ہندوستان کے جنوبی ساحلوں پر یہودیوں کی بستیاں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ابتدا میں مسیحی مبلغ جنہیں حضرت مسیحؑ (رسولوں) کے نام سے یاد کرتے تھے عام طور پر انہی علاقوں میں بھیجے جاتے تھے جہاں اسرائیلی (یہودی) آباد ہوتے تھے چنانچہ مشہور انجیل نویس مرقس نے جب وہ اسکندریہ میں مقیم تھے وہاں سے کچھ مسیحی مبلغ ہندوستان بھیجے تھے۔ (12-B)

ایسے ہی علاقوں میں مالا بار بھی شامل ہے چنانچہ ایک ممتاز مسیحی مورخ لکھتا ہے کہ مالا بار کے یہودیوں میں نسل در نسل یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ ان کے اسلاف یروشلم سے آ کر اس علاقے میں آباد ہوئے اور اس وقت یروشلم سے آنے والے ان یہودیوں کی تعداد دس ہزار کے قریب تھی۔ ان لوگوں نے جس جگہ سکونت اختیار کی اس کا نام "کرنگا نور" ہے۔ آج بھی کوچین کے مضافات میں ایک بستی آباد ہے جس کا نام ہے "مٹن چربی" یعنی "یہودیوں کا شہر"-- (12-C)

کشمیر میں بنی اسرائیل

اب آپ برصغیر پاک و ہند کے انتہائی شمالی سرے پر آیئے --- کشمیر کی وادی جنت نظیر جس کے باشندوں کی بہت بڑی اکثریت پکار پکار زبان حال سے کہہ رہی ہوگی کہ وہ بنی اسرائیل کی اولاد ہیں۔ یہاں آباد لوگ اپنے سرخ و سپید رنگ، اپنے تیکھے خدوخال، اپنے لباس اور طرز بود و باش کے لحاظ سے اسرائیلیوں سے اتنے مشابہ ہیں کہ اس علاقے کا سفر کرنے والے سیاحوں اور محققوں نے پہلی نظر ہی میں انہیں اسرائیلی النسل قرار دیا اور بے ساختہ پکار اٹھے کہ یہ حضرت یعقوبؑ کی اولاد ہیں چنانچہ ایک مغربی اسکالر اور سیاح جارج فارسٹر (GEORGE FARSTER) لکھتا ہے کہ:-

"کشمیریوں کے ملک میں جا کر اور انہیں پہلی دفعہ دیکھ کر ان کے لباس، ان کے خدوخال کی بناوٹ اور ان کے کھانوں کی اقسام کا مشاہدہ کر کے میں یوں محسوس کرنے لگا کہ گویا کہ یہودیوں کی قوم میں آ گیا ہوں۔"-- (13)

خود کشمیر کے ہندو مورخین بھی جن کا اس مسئلے سے براہ راست کوئی تعلق نہیں اور نہ جن کی اس معاملے سے کوئی جذباتی وابستگی ہے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ

کشمیر میں اسرائیلی گروہ آباد ہیں وہ اس کی دو مضبوط دلیلیں یہ دیتے ہیں کہ:-

(i) یہاں کے لوگ اپنے بچوں کے نام موسیٰ رکھتے ہیں اور یہ نام بہت عام ہے۔

(ii) یہاں بہت سی ایسی یادگاریں ہیں جن سے یہ تاثر ملتا ہے کہ اس سرزمین پر جو لوگ آباد ہیں ان کا ضرور اسرائیل سے تعلق ہے۔ ان یادگاروں میں ایک قدیم مگر عظیم الشان عمارت کے کھنڈرات آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں جو پہاڑ کی بلند چوٹی پر واقع ہے اور جسے تخت سلیمان کہا جاتا ہے۔--(14)

تخت سلیمان کے علاوہ یہاں ایک قبر بھی ہے جسے حضرت موسیٰ کی قبر قرار دیا جاتا ہے۔ گو یہ قبر حضرت موسیٰؑ پیغمبر کی ہرگز نہیں کیونکہ جن حالات میں ان کی وفات ہوئی تھی اور جس دور میں ہوئی تھی اس میں ان کی نعش کا کشمیر لایا جانا بالکل خلاف عقل اور خلاف واقعہ ہے البتہ کسی اسرائیلی بزرگ کی قبر ضرور ہے جن کا نام موسیٰ تھا کیونکہ اسرائیلی لوگ بعض دوسری اقوام کی طرح اپنے بچوں کے نام اپنی قوم کے اکابر کے نام پر رکھا کرتے تھے۔ پس یہاں موسیٰ نام کے ایک بزرگ کی قبر کا موجود ہونا اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ یہاں ایسے لوگ صدیوں سے آباد ہیں جو حضرت موسیٰؑ کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

(iii) یہاں ایسی قبور موجود ہیں جن کا رخ شرقاً "غرباً" ہے جس رخ پر بنی اسرائیل اپنی میتیں دفن کیا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض قبروں پر عبرانی عبارتیں کندہ ہیں جو بنی اسرائیل کی زبان تھی۔

ایک اور محقق مسٹر فرانکوئس برنیئر (MR. FRANCOIS BERNIER) جو کئی برس مغل شہنشاہ اورنگزیب کے دربار سے وابستہ رہے اپنے ایک دوست تھیوناٹ (THEVENOT) کے استفسار پر لکھتے ہیں کہ اس ملک (کشمیر) میں ایسے بہت سے آثار پائے جاتے ہیں جو اس سرزمین پر یہودیوں کی موجودگی کا ثبوت دیتے ہیں چنانچہ جب میں کوہ پیر پنجال کو عبور کر کے کشمیر میں داخل ہوا تو حیرت زدہ رہ گیا کیونکہ میں نے دیکھا کہ سرحدی دیہات کے باشندوں کے خدوخال بالکل یہودیوں جیسے تھے ان کے چہرے مہرے کے علاوہ ان کی عادات و اطوار کی حیرت انگیز خصوصیات ایک سیاح کو یہ سوچنے پر

مجبور کر دیتی ہیں کہ یہ (کشمیری) لوگ (مقامی باشندے نہیں ہیں) کسی اور ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو ایک قدیم نسل بنی اسرائیل کے افراد ہیں۔ میرے اس بیان کو تم افسانہ مت سمجھنا ان علاقوں میں یہودیوں کی موجودگی کی طرف ہمارے خداوند یسوع مسیحؑ نے بھی اشارہ کیا ہے اور اس علاقے میں میرے وارد ہونے سے قبل یورپی مورخوں نے بھی اس کی تصدیق کی ہے (کہ کشمیر میں اسرائیلی نسل کے لوگ آباد ہیں)--(15)

شہنشاہ اورنگزیب ہی کے ایک اور درباری مسٹر ایس منوچی (MR S. MANOUCHI) نے جو شاہی طبیب تھے اور بادشاہ کے ساتھ کشمیر کا سفر بھی کر چکے تھے اپنی یادداشتوں میں اہل کشمیر کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کئے تھے وہ لکھتے ہیں کہ کشمیر میں ایک روایت بہت عام ہے جس کی رو سے بادشاہ (شلما نسے) (SHALMA NESSER) جن یہودیوں کو گرفتار کر کے لایا تھا انہیں کشمیر میں آباد کر دیا گیا تھا اور کشمیر کے موجودہ باشندے انہی اسرائیلیوں کی نسل ہیں۔ اگرچہ اب کشمیر میں یہودی مذہب کے آثار نہیں پائے جاتے کیونکہ یہ لوگ یا تو ہندو اور بدھ ہو گئے ہیں یا مسلمان، مگر اس کے باوجود ان لوگوں میں ابھی تک ایسے آثار اور نشانیاں پائی جاتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اسرائیلی نسل کے لوگ ہیں۔ چنانچہ ان کے چہروں کی بناوٹ، ان کے اخلاق و عادات اور طور طریقے ایسے ہیں جو یہودیوں ہی میں پائے جاتے ہیں اور ان لوگوں کو دوسری اقوام سے ممتاز کرتے ہیں--(16)

برصغیر پاک و ہند کے مشہور و ممتاز ادیب اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ اقدس کے سجادہ نشین حضرت خواجہ حسن نظامی مرحوم و مغفور نے اپنے سفر کشمیر کے دوران اہل کشمیر کی عادات و اطوار اور خدوخال کا بغور مشاہدہ کیا اور پھر اپنے روزنامچے میں لکھا:-

"عصر کے بعد روانگی ہوئی اور مغرب سے پہلے پہاڑ کے نیچے آ گئے، راستے میں ڈانڈی اٹھانے والے کشمیری مسلمانوں کے خصائل کا بہت اچھی طرح مطالعہ کیا اور پوری طرح یقین ہو گیا کہ اس ملک میں ضرور بنی اسرائیل آئے تھے اور یہ لوگ اسی نسل سے ہیں۔"--(17)

البیرونی کی شہادت

شہرۂ آفاق سیاح البیرونی جب ہندوستان آیا تو کشمیر بھی گیا اپنے سفرنامے میں اس نے کشمیر کے حالات بیان کرتے ہوئے ایک ایسا فقرہ بھی لکھ دیا جو اس موضوع پر غور کرنے والوں کو دعوت فکر دیتا ہے۔ البیرونی لکھتا ہے:۔

"کشمیر ایک میدان ہے جس کو چاروں طرف سے اونچے اور محفوظ پہاڑ گھیرے ہوئے ہیں... کشمیر کے باشندے پا پیادہ چلتے ہیں۔ ان کے پاس چار پایہ جانور اور ہاتھی نہیں ہیں۔ یہ لوگ جگہ محفوظ رکھنے کا خاص اہتمام رکھتے ہیں اور دروں اور راستوں کو ہمیشہ احتیاط کے ساتھ بند رکھتے ہیں اس لئے ان سے ملنا جلنا مشکل ہے اگلے وقتوں میں ایک دو اجنبی خصوصاً" یہود داخل ہو جاتے تھے۔" (17-A)

اس عبارت میں دو باتیں غور طلب ہیں پہلی یہ کہ البیرونی نے سارے ہندوستان کی سیاحت کی اور ہر علاقے کے باشندوں کے رسم و رواج اور عادات و اطوار کا ذکر کیا مگر صرف کشمیریوں کے بارے میں لکھا کہ یہ لوگ اپنے ملک کے دروں اور راستوں کو بند رکھنے کا خاص خیال رکھتے ہیں اس لئے ان سے ملنا جلنا خاصا مشکل ہے۔ آخر صرف کشمیری ہی اپنے علاقے کے دروں اور راستوں کی حفاظت کیوں کرتے تھے اور انہیں ہر کس و ناکس کے لئے کیوں نہیں کھولتے تھے۔ اس کی ایک ہی وجہ ہے کہ ان کے اجداد و اسلاف بیرونی حملوں کا شدت سے نشانہ بنے تھے آشوریوں اور بابلیوں (بخت نصر وغیرہ) نے آہن گداز مظالم ان پر توڑے تھے اس لئے احتیاط اور غیر معمولی حفاظتی تدابیر ان کے مزاج کا حصہ بن گیا۔ دوسرے یہ کہ بنی اسرائیل میں اپنی تہذیب اور نسل کو محفوظ رکھنے کا احساس بہت شدت سے پایا جاتا تھا۔ چنانچہ جن سیاحوں نے افغانستان کا دورہ کیا انہوں نے بھی اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ یہ لوگ اپنی الگ بستیاں بسا کر رہتے ہیں اور دوسری اقوام کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنے اور ان میں MIXUP ہونے سے گریز کرتے ہیں۔ اس سے ان مغربی سیاحوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ لوگ بنی اسرائیل کی اولاد ہیں۔ اسی طرح کشمیری بھی شروع میں دوسری اقوام میں MIX UP ہونے سے گریز کرتے تھے تاکہ ان کی تہذیب، نسل اور زبان محفوظ رہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ

لوگ بنی اسرائیل ہیں۔ البیرونی کے آخری فقرے نے تو بات بالکل واضح کر دی چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"اگلے وقتوں میں ایک دو اجنبی خصوصاً" یہودی داخل ہو جاتے تھے۔"

البیرونی کہتا ہے کہ " اگلے وقتوں میں " ۔۔۔۔ یعنی زمانہ قدیم میں جب تک یہودیوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا صرف وہ کشمیر میں داخل ہو سکتے تھے۔ آخر صرف بنی اسرائیل کو کشمیر میں داخل ہونے کی اجازت کیوں تھی؟ باقی اقوام اور لوگوں پر پابندی کیوں تھی؟۔ اس کا ایک ہی جواب ہے کہ اہل کشمیر خود بنی اسرائیل تھے اس لئے بنی اسرائیل کے سوائے اور کسی کو ریاست میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے تاکہ ان کی آبادیاں، ان کی تہذیب اور ان کی نسل متاثر نہ ہو اور ان کا قومی تشخص برقرار رہے جس کے وہ اقوام عالم میں سب سے بڑے علم بردار تھے۔ گویا البیرونی کے سفرنامے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں کشمیر بنی اسرائیل کی سب سے بڑی آبادی تھی۔

ایک اور غیر جانبدارانہ شہادت بہت قابل توجہ ہے۔ ایک انگریز ریٹائرڈ سی ایس پی افسر مسٹر سی ایف سٹرکلینڈ نے کشمیری لوگوں کے عادات و خصائل اور ان کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد ایک مضمون لکھا جس کا اردو ترجمہ لاہور کے مشہور اخبار "ویر بھارت" میں شائع ہوا یہ انگریز مسیحی افسر اپنے اس مضمون میں لکھتا ہے

"بہت سے خاندان (اہل کشمیر کے) اپنے آپ کو بنی اسرائیل کی اولاد خیال کرتے ہیں ان کی شکل و صورت بھی یہودیوں جیسی ہے ان لوگوں میں یہ بھی روایت ہے کہ جب حضرت مسیحؑ کو زندہ صلیب سے اتار لیا گیا تو وہ ان قوموں کی تلاش میں مشرق کی طرف چل پڑے جو اس طرف آباد تھیں اور سری نگر میں فوت ہوئے یہاں یوز عارف (یوز آسف) نام کی ایک قبر ہے جسے مسیحؑ کی قبر بیان کیا جاتا ہے۔" (18)

زمانہ حال کے ایک مغربی مسیحی مورخ مسٹر ہولگر کرسٹن (HOLGER KERSTEN) نے ہندوستان کا سفر کیا تھا۔ وہ کشمیر بھی گئے تھے پھر انہوں نے حضرت مسیحؑ کے بارے میں ایک تحقیقی کتاب لکھی۔ اس میں بہت سے امور پر روشنی ڈالنے کے علاوہ فاضل مورخ

نے کشمیر میں بنی اسرائیل کے آثار کا جائزہ لیا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

" مری سے کشمیر کے دارالحکومت سری نگر تک ایک سو ستر کلو میٹر لمبی سڑک جاتی ہے۔ سری نگر سے چالیس کلو میٹر جنوب کی طرف "ناؤ گاؤں" اور "نیل ماگ" نامی دیہات کے درمیان ایک جگہ ہے' یہ جگہ یوز مرگ کے نام سے مشہور ہے (یعنی یوز کی چراگاہ) یہ جگہ میدانی علاقے میں واقع ہے۔ یہاں ۷۲۲ قبل مسیحؑ میں بنی اسرائیل آ کر آباد ہوئے تھے جہاں انہوں نے بھیڑ بکریاں پال کر اپنی معاش کا انتظام کیا تھا۔ انہی کو یسوع نے آ کر تبلیغ کی اور اللہ کا پیغام پہنچایا۔ (18-A)

عیسیٰ اور یسو کے نام

وادی کشمیر اور ہندوستان کے بعض دیگر علاقوں میں بہت سے شہروں' دیوتاؤں اور بادشاہوں کے نام عیسیٰ اور یسو (یسوع) کے نام پر رکھے گئے چنانچہ ہندوستان کی قدیم ترین تاریخی کتاب "راج ترنگنی" میں ایسے بہت سے نام ملتے ہیں۔ یہ کتاب سنسکرت زبان میں ہے اس کا انگریزی میں ترجمہ مسٹر اسٹائین نے کیا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کشمیر اور ہندوستان کے بعض اور علاقوں کے لوگوں کا نسلی تعلق بنی اسرائیل سے ضرور تھا اور وہ حضرت مسیحؑ کے عقیدت مند تھے۔ ان ناموں کی ایک مختصر سی فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔

عیسیٰ مندر:۔ کشمیر کے مقام "بدر گاؤں" کے جنوب مشرق میں قریباً دو میل کے فاصلے پر ایک قدیم عبادت گاہ کا نام "عیسیٰ مندر" تھا۔ (19)

عیسیٰ اور "یز":۔ ایک ایسے دیوتا کی پرستش کی جاتی تھی جس کا نام عیسیٰ اور "یز" تھا (یز دراصل یوز اور یسوع کی بگڑی ہوئی شکل ہے) (20)

عیسیٰ وارہ:۔ کشمیر کے قدیم دارالسلطنت کو عیسیٰ وارہ اور "یز" (یوز اور یسوع) کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ (21)

عیسیٰ بوٹی:۔ کشمیر میں ایک بوٹی کا نام عیسیٰ بوٹی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ جہاں اگتی اور پھیلتی ہے وہاں کوئی دوسری بوٹی نہیں پھیلتی۔ (22)

یسو:۔ یسو نام کے افراد اور مقامات بھی کشمیر میں بہت سے تھے۔ یسو دتی (یسوع دتی۔

یعنی یسوع کی دی ہوئی) نام کی ایک ملکہ بھی اس نواح میں گذری ہے۔ (23)

یسو سکارا:۔ یسو دہارا۔ یسومنگا۔ یسو متی۔ یسو ورما۔ یسوراجا۔ یسو راجا۔ یہ سب نام کشمیر میں رکھے جاتے تھے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یسو (یسوع' حضرت مسیحؑ) کو کشمیر میں غیر معمولی عزت و عظمت حاصل تھی۔

آثار قدیمہ کے ایک انگریز ماہر مسٹر بارنٹ نے (Antiquities OF INDIA" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے اس کتاب میں ہندوستان کے ایسے بہت سے بادشاہوں کا ذکر ہے جن کے نام کا جزو عیسیٰ اور یسو (یسوع) تھا مثال کے طور پر:۔

۴۸۰ء میں ہندوستان کا ایک بادشاہ گزرا ہے جس کا نام عیسیٰ وارہ تھا۔ (24)

ہمالیائی ریاست "کماؤں" کے راجہ کا نام "عیسیٰ گھانا" تھا۔ (25)

ہندوستان کے ایک بادشاہ ورمادیو کے باپ کا نام یسو دیو (یسوع دیو) تھا۔ (26)

وسط ہند میں ایک بادشاہ گزرا ہے جس کا نام یسو دھرمن (یسوع دھرمن) تھا (27)

وجیا گڑھ کے قریب واقع ایک ریاست کے راجہ کا نام یسو وردھانا (یسوع وردھانا) تھا' ایک راجہ یسو راتا (یسوع راتا) نام کا بھی گزرا ہے۔ (28)

اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں ایک دیوتا کا نام "عیسیٰ نا" تھا جس کی لوگ پرستش کرتے تھے۔ (29)

اصول کافی کی شہادت

مسلمانوں کے ایک مشہور فرقے کی کتاب "اصول کافی" ہے جو اس فرقے کے نزدیک نہایت مستند سمجھی جاتی ہے اور اس فرقے کے اعتقادات اور تعلیمات کا انحصار اور اس کی بنیاد اسی کتاب "اصول کافی" پر ہے اس میں ایک نہایت ایمان افروز واقعہ درج ہے واقعہ یوں شروع ہوتا ہے:۔

" علی بن محمد و عن غیر واحد من اصحابنا القمیین"......

یعنی علی بن محمد اور ان کے علاوہ قم کے اور کئی احباب نے محمد بن عامر سے اور انہوں نے ابو سعید غانم ہندی سے بیان کیا کہ انہوں نے کہا کہ میں ہندوستان کے علاقے کشمیر داخلہ (اندرون کشمیر) میں رہتا تھا میرے چالیس ساتھی بھی تھے جو بادشاہ کے داہنی

طرف کرسیوں پر بیٹھا کرتے تھے اور ہم سب (اعیان دربار) کتب اربعہ 'تورات 'انجیل 'زبور 'صحف ابراہیم کے عالم تھے اور ہم (انہی کتب کے ذریعے) لوگوں کے مقدمات و معاملات کے فیصلے کرتے تھے بادشاہ اور اس کے علاوہ دوسرے لوگ بھی ہماری طرف ہی رجوع کرتے تھے۔ (29-A)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک زمانہ ایسا گذرا ہے جب کشمیر کے عوام سے لیکر بادشاہ تک سب کے سب تورات 'انجیل 'زبور اور صحف ابراہیم کی پیروی کرتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں بائبل ان کی مقدس کتاب تھی وہ مسلمان بھی نہیں تھے کیونکہ آگے چل کر اس روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ پھر انہیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضورؐ کے دین کے بارے میں خبر دی گئی اور ان میں سے ایک شخص رسولؐ اقدس اور اسلام کی حقانیت کے بارے میں تحقیق کرنے کے لئے روانہ ہوا اس کے بعد اس خطے پر اسلام کا سورج طلوع ہوا۔ یہاں جو بات غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ "اصول کافی" کی اس روایت کے مطابق کشمیر کے لوگ جب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اس وقت تک وہ بھی اور ان کا حاکم بھی ایک ایسے دین کے پیرو تھے جس کی بنیاد تورات پر تھی ظاہر ہے کہ یہ لوگ بنی اسرائیل تھے جو مسیحی ہو گئے تھے۔ یہ اتنی بڑی تعداد میں تھے کہ ان کی حکومت بھی قائم تھی۔ گویا اس روایت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ کشمیر میں بنی اسرائیل کی بہت بڑی تعداد آباد تھی جو اپنی مقدس کتاب کے اصولوں اور تعلیم کے مطابق زندگی گذارتی تھی۔

کشمیری زبان میں عبرانی الفاظ

زبان کسی قوم کی تہذیب و ثقافت حتیٰ کہ جذبات کی آئینہ دار ہوتی ہے اور اس کا اوریجن (ORIGIN) (اصل) معلوم کرنے کے سلسلے میں رہنما کا کام دیتی ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے جب ہم کشمیری زبان پر غور کرتے ہیں تو خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ اس زبان میں قریب قریب (تیس) فی صد الفاظ عبرانی کے ہیں جو بے تکلفانہ طور پر کشمیری زبان میں استعمال ہوتے ہیں قریباً" نصف صدی قبل ایک فاضل محقق مولانا محمد صادق مرحوم نے کشمیر جا کر تحقیق کی اور اپنے کشمیری دوستوں کی مدد سے ایسے الفاظ کی فہرست مرتب کی جو

اصلاً" عبرانی کے ہیں اور اب کشمیری میں استعمال ہو رہے ہیں۔ یہ فہرست موصوف نے اپنی کتاب "تحقیق جدید" میں شائع کر دی تھی اس فہرست سے کچھ الفاظ بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

نمبر شمار	عبرانی	اردو میں معنی	کشمیری
(۱)	اتوہ	آپ۔ آواز دینے کے معنی میں	"ہاتو" اور "اتو"
(۲)	ادر	چادر	ژادر
(۳)	صنن	چبھنا	صنن
(۴)	عبر	پار کرنا	عبور
(۵)	مس	دبلا ہونا	مس
(۶)	فاہ' فو	پھونکنا	فو
(۷)	یوس	روندا جانا	یس
(۸)	کوہ	کس طرح	کوہ
(۹)	توہ	پریشان ہونا	توہ (بھوسہ)
(۱۰)	بکا' بکہ	رونا	باک
(۱۱)	سکر	روک دینا	سکری
(۱۲)	حمہ	شور مچانا	ھم ھم
(۱۳)	اوہ	ہائے	اوہ
(۱۴)	دقر	چوٹ	ڈقر (ہتھوڑی)
(۱۵)	درک	پکڑ لینا	درک (جونک کے لئے استعمال ہوتا ہے)
(۱۶)	یطل	شہتیر	یطل
(۱۷)	طما	سائے میں آرام کرنا	طم
(۱۸)	شاس	ہانپنا	شانس
(۱۹)	اول	غلط راہ اختیار کرنا۔ بے وقوف	ھول
(۲۰)	ایم	ڈرانا	یم (موت ۔ دھمکانا)

(۲۱)	درج	رفتہ رفتہ اوپر چڑھنا	درج (مہنگا ہونا)
(۲۲)	زوہ	چھپانا	زوہ (گڑھا کھود کر کسی چیز کو مٹی میں دبانا)
(۲۳)	ھوت	ناچیز سمجھنا	ھون (حقیر چیز کتا)
(۲۴)	آسبل	آرام طلب ست	آلص
(۲۵)	ماتھوق	میٹھا	ماٹھو
(۲۶)	گیھر	زور آور جوان	گبر
(۲۷)	آکھ	اکیلا	اکھ
(۲۸)	پراتھ	افراط	فراتھ
(۲۹)	بخت نصر	ظالم، سفاک، گالی جیسے یزید	بوخت نصور
(۳۰)	راشہ	شریر	راشہ
(۳۱)	گاال	گھن آنا	گال
(۳۲)	لااگ	نقل اتارنا۔ مذاق اڑانا	لاگن
(۳۳)	گااژ	ڈانٹنا	گاز
(۳۴)	اطر	عیب، گناہ	اطر
(۳۵)	الیش	چمک، آگ	السی
(۳۶)	اتھہ	آنا	تیہ
(۳۷)	بدر	الگ کرنا	بدر
(۳۸)	دوہ	غم زدہ ہونا	دو
(۳۹)	دمہ	اقبال مندی	دم
(۴۰)	ھس	چپ چاپ	ھس مس
(۴۱)	زحل	ڈرنا	زحل
(۴۲)	زن	مثل۔ جنس	زن
(۴۳)	لول	محبت سے لپٹنا	لول
(۴۴)	یرط	پٹخ دینا	یرط، ورط

(۴۵)	شیث	ساتھ رکھنا	سیت (ساتھ)
(۴۶)	شنا	بدل جانا	ثنا (ویران ہونا بدل جانا)
(۴۷)	ابل	عبرانی میں گھاس کا میدان	ابل (ایک قسم کی گھاس)
(۴۸)	آز	اس وقت	آز (آج)
(۴۹)	زھ	بنی اسرائیل کا دوسرا مہینہ	زھ (دو)
(۵۰)	نقل	دغا بازی کرنا	نقلہ (دغا باز دغا بازی کی باتیں)

یہ پچاس ایسے الفاظ ہیں جو عبرانی کے ہیں اور انہی معنی میں بے تکلفانہ طور پر کشمیری زبان میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ فہرست صرف پچاس الفاظ پر مشتمل نہیں ہے ان کی تعداد ساڑھے تین سو ہے یہ وہ الفاظ ہیں جو شمار کر لئے گئے ہیں اگر اس موضوع پر مزید تحقیق کی جائے تو مزید سینکڑوں الفاظ ایسے نکلیں گے جو عبرانی کے ہیں اور اب کشمیری میں نہایت بے تکلفی سے استعمال ہو رہے ہیں۔ یہ بہت بڑا ثبوت اس امر کا ہے کہ کشمیر کے لوگوں کی بہت بڑی تعداد بنی اسرائیل سے تعلق رکھتی ہے جن کے اجداد واسلاف فلسطین اور اس کے مضافات سے آکر کشمیر میں آباد ہوئے' وہ مدتوں اپنی مادری زبان عبرانی ہی بولتے رہے مگر رفتہ رفتہ دوسری اقوام میں رہنے بسنے کی وجہ سے ان کی زبان پر مقامی اور ہمسایہ اقوام کا رنگ غالب آ گیا مگر آج بھی اس پر عبرانی کی چھاپ موجود ہے۔

کشمیریوں کی عادات و خصائل

ہر قوم کی کچھ عادات و خصائل ہوتے ہیں یہ عادات و خصائل اس قوم سے خاص ہوتے ہیں۔ اگر یہی عادات و خصائل دوسری قوم میں پائے جائیں اور ان کے علاوہ بھی کچھ آثار و قرائن موجود ہوں تو یہ دوسری قوم لازمی طور پر پہلی قوم کا ہی حصہ قرار دی جاتی ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھیں تو بھی کشمیری بنی اسرائیل کا حصہ معلوم ہوتے ہیں چنانچہ:۔

(۱) بنی اسرائیل میں رواج تھا کہ ایک بھائی کے فوت ہو جانے پر اس کی بیوہ سے مرحوم کا دوسرا بھائی شادی کر لیتا تھا کیونکہ تورات میں انہیں اس کی ہدایت کی گئی تھی انجیل میں بھی اسی حکم کا اعادہ کیا گیا ہے کہ:۔

اگر کسی کا بیاہا ہوا بھائی بے اولاد مرجائے تو اس کا بھائی اس کی بیوی کو کر لے (یعنی اس سے نکاح کر لے) اور اپنے بھائی کے لئے نسل پیدا کرے۔ (30)

اہل کشمیر میں بھی رواج تھا کہ اپنے بھائی کی وفات پر اس کی بیوہ سے شادی کر لیتے تھے تا کہ اس کے شوہر کا خاندان اس بیوی سے اولاد حاصل کرنے کے معاملے میں محروم نہ رہ جائے۔

(۲) بنی اسرائیل میں رواج تھا کہ شادی کے بعد لڑکی والے اپنے داماد کو کچھ مدت تک اپنے گھر میں رکھتے تھے چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے کہ جب حضرت شعیبؑ نے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اپنی بیٹی کی نسبت طے کی تو ایک شرط یہ بھی تھی کہ شادی کے بعد حضرت موسیٰؑ اپنے خسر کے گھر میں کم از کم آٹھ سال ضرور گذاریں گے ورنہ دس سال (القرآن۔ سورۃ القصص آیت نمبر ۲۷)

حضرت موسیٰؑ نے یہ شرط منظور کر لی اور مدت مقررہ حضرت شعیبؑ کے گھر میں گذاری۔ حضرت موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل میں یہ رسم جاری رہی۔ کشمیری بھی اپنے داماد کو کچھ مدت گھر میں رکھتے تھے۔ ظاہر ہے ان میں یہ رسم بنی اسرائیل ہی سے آئی تھی۔

(۳) بنی اسرائیل سالن میں گھی، مکھن یا چربی کا بگھار نہیں لگاتے بلکہ تیل کا بگھار لگاتے تھے چنانچہ ایک فاضل محقق مولانا محمد صادق مرحوم نے ایک یہودی عالم مسٹر حوتیل سے جو ایک یہودی درس گاہ میں ہیڈ ماسٹر تھے اور بمبئی میں مقیم تھے سوال کیا کہ آپ کی تحقیق کی رو سے کیا کشمیر کے لوگ اسرائیلی نسل سے تعلق رکھتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس کا ایک آسان طریقہ ہے وہ یہ کہ یہود کے لئے ایک مذہبی حکم ہے کہ وہ کھانے میں گھی، مکھن یا چربی کا بگھار نہ لگائیں بلکہ تیل کا بگھار لگائیں یہودی اس حکم کی سختی سے پابندی کرتے ہیں اگر وہ کسی دوسرے ملک میں نقل مکانی کر جائیں تو بھی بطور عادت اس حکم پر عمل کرتے ہیں۔ اگر کشمیری بھی اپنے سالن میں تیل کے سوائے اور کسی چیز کا بگھار نہیں لگاتے تو وہ بنی اسرائیل میں سے ہیں۔

جب تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ کشمیر کے لوگ خواہ امیر ہوں یا غریب سالن میں

گھی مکھن یا چربی کا بگھار نہیں لگاتے بلکہ صرف تیل کا بگھار لگاتے تھے اس کی ایک شہادت مولانا محمد صادق مرحوم نے اپنی کتاب میں یہ دی ہے کہ ایک کشمیری رہنما مولوی ہمدانی آزادی کشمیر کی تحریک میں حصہ لینے کے جرم میں ریاست سے جلا وطن کر دیے گئے (۱۹۲۳ء کے قریب) جب واپسی کی اجازت ملی اور وطن آئے تو بیمار تھے۔ دریافت کرنے پر ہمدانی صاحب نے بتایا کہ "ریاست کے باہر لوگ سالن میں گھی کا بگھار لگاتے ہیں یہ سالن کھاتے رہنے کی وجہ سے میں بیمار ہو گیا" گویا تصدیق ہو گئی کہ کشمیری بھی سالن میں گھی کا بگھار نہیں لگاتے بلکہ وہ صرف تیل کا بگھار لگاتے تھے جس طرح بنی اسرائیل میں رواج تھا۔

اسرائیلی آثار

کسی معاملے کی سچائی کے بارے میں کچھ ایسے قرائن بھی قابل قبول ہوتے ہیں جن کی اگرچہ کوئی دستاویزی شہادت تو پیش نہیں کی جا سکتی مگر جو روایات سینہ بہ سینہ نہایت تسلسل سے چلی آ رہی ہوں اور ان کے ساتھ کچھ دوسری شہادتیں بھی موجود ہوں تو انہیں آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ کسی روایت کا قرین عقل ہونا اور اس کے بارے میں تواتر کا پایا جانا ہی اسے تاریخ کا حصہ بنا دیتا ہے۔ تاریخ بنتی ہی اسی طرح ہے چنانچہ کشمیر کی دور دراز وادیوں میں جانے والوں نے تصدیق کی ہے کہ اندرون کشمیر بہت سے ایسے آثار پائے جاتے ہیں جن سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں اول یہ کہ جناب مسیحؑ یقیناً اس وادی میں تشریف لائے تھے دوسری بات یہ کہ ان علاقوں میں زمانہ قدیم میں بھی بنی اسرائیل کی بستیاں آباد تھیں۔

(۱) چنانچہ سیاحوں اور کشمیر کے لوگوں کا بیان ہے کہ ریاست میں ایک مقام ہے وارہ پورہ جسے واڑہ پورہ بھی کہتے ہیں۔ یہاں ایک چشمہ ہے جو "نبی صاحب کا چشمہ" کہلاتا ہے اور روایت یہ ہے کہ اس چشمے کے قریب حضرت مسیحؑ ناصری نے لوگوں سے خطاب فرمایا تھا یہ چشمہ ترہگام سے سات میل دور جنوب مغرب کی طرف واقع ہے۔

(۲) کشمیر میں متعدد مقامات پر ایسے قبرستان برآمد ہوئے ہیں جن کی قبروں کے رخ شرقاً غرباً ہیں ظاہر ہے کہ یہ قبریں مسلمانوں کی نہیں ہو سکتیں کیونکہ مسلمان اپنے

مرحومین کی قبریں شرقاً غرباً نہیں بلکہ شمالاً جنوباً بناتے ہیں اور ہندو اور بدھ اپنے مردوں کی قبریں بناتے ہی نہیں وہ تو انہیں جلاتے ہیں پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ قبریں بنی اسرائیل کی ہیں۔

(۳) سری نگر میں شالا مار باغ کے نام سے ایک مشہور تاریخی عمارت واقع ہے اس کی ایک سیڑھی پر کچھ الفاظ کندہ تھے جو اگرچہ اب مٹ گئے ہیں مگر کچھ باقی رہ گئے ہیں ان میں سے دو صاف پڑھے جاتے ہیں ایک "ک" اور دوسرا "ل" جو لوگ عبرانی زبان میں کچھ بھی شد بد رکھتے ہیں وہ تصدیق کریں گے کہ مندرجہ ذیل دونوں حروف عبرانی ہیں۔

ک (ל) ل (כ)

(۴) "ویدر کوٹ" میں بعض ایسی قبریں ابھی تک موجود ہیں جن پر عبرانی زبان سے مشابہ حروف کندہ ہیں یہ بستی یعنی "ویدر کوٹ" ایک مشہور مقام یاڑی پورہ کے قریب واقع ہے۔

"مزار سلاطین" نامی قبرستان میں بعض ایسی قبریں ہیں جن پر عبرانی حروف کندہ ہیں۔ کشمیر کے موجودہ دارالسلطنت (سری نگر) سے قریباً تین میل کے فاصلے پر ایک شہر آباد تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ قدیم حکمرانان کشمیر کا دارالسلطنت تھا اس جگہ کا نام "پانڈرین تھان" تھا یہاں ایک عمارت واقع تھی جس کے کھنڈرات ابھی تک موجود ہیں۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ پانڈرین تھان جگہ کا نہیں بلکہ اس عمارت کا نام تھا۔ اس عمارت پر کچھ ایسے نقش و نگار کندہ ہیں جن پر عبرانی حروف کا گمان گذرتا ہے اس عمارت کے بارے میں قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ عبادت گاہ تھی۔ ظاہر ہے کہ عبرانی زبان بنی اسرائیل کی تھی اس عمارت پر عبرانی یا اس سے مشابہت رکھنے والی زبان کے حروف کا کندہ ہونا ثابت کرتا ہے کہ یہاں اسرائیلی لوگ آباد تھے۔

(۵) کشمیر میں مارتند نامی ایک علاقہ ہے جہاں ایک قدیم عمارت واقع ہے۔ کشمیری اسے "تخت سلیمان" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس عمارت کا طرز تعمیر خالص اسرائیلی ہے اس کے قریب ایک پتھر پر کسی چیز کا نشان ہے جسے حضرت مسیحؑ کے گدھے

کے "کھر" کا نشان کہا جاتا ہے۔ حیدر آباد دکن کی ممتاز شخصیت نواب آسمان جاہ کے سیکریٹری کرنل کاک برن نے لکھا ہے کہ جب وہ کشمیر کی سیاحت کر رہے تھے تو انہیں اس تاریخی یادگار کے بارے میں بتایا گیا کہ یہ جناب مسیحؑ کے گدھے کے کھر کا نشان ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ نشان حضرت مسیحؑ کے گدھے کے کھر کا ہے یا نہیں؟ غور طلب بات یہ ہے کہ اگر حضرت مسیحؑ کشمیر تشریف نہیں لائے تو ان سے اس قسم کی یادگاریں کیسے منسوب ہو گئیں۔ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ کشمیر میں ایک چشمہ ہے جسے نبی صاحب کا چشمہ کہتے ہیں اور اس کی تفصیل یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس چشمہ کے قریب جناب مسیحؑ نے وعظ فرمایا تھا۔

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ میں یہ روایت تسلیم نہیں کرتا وہ تسلیم نہ کرے لیکن یہ تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس وادی میں ایسی متعدد روایات تواتر سے مشہور ہیں کہ جناب مسیحؑ یہاں آئے تھے۔ انہوں نے فلاں چشمے پر وعظ کہا تھا۔ فلاں جگہ قیام فرمایا تھا۔ فلاں جگہ ان کے گدھے کو ٹھوکر لگی تھی یا کسی اور وجہ سے ایک پتھر پر ان کے گدھے کے "کھر" کا نشان بن گیا تھا۔ اگر جناب مسیحؑ کشمیر نہ آئے ہوتے تو اس قسم کی روایتیں ہرگز مشہور نہیں ہو سکتی تھیں۔ آخر حضرت ابراہیمؑ حضرت الیاسؑ حضرت ادریسؑ یا حضرت یونسؑ کے بارے میں اس قسم کی روایات کیوں مشہور نہیں ہوئیں؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان میں سے کوئی نبی کشمیر میں نہیں آیا اس لئے اس کے بارے میں ایسی کوئی روایت مشہور نہیں ہوئی چونکہ حضرت مسیحؑ کشمیر میں تشریف لائے تھے اور یہاں قیام فرمایا تھا اس لئے آپؑ کے بارے میں اس قسم کی روایات مشہور ہوئیں اور تاریخ کا جزو بن گئیں۔

حوالہ جات

(1) "Jesus In Rome" By Robert Graves And Joshua Podro, Cassel And Company Ltd. London, P-13

(2) "The Lost Tribes, A Myth" By Dr. Allen H. Godbey, Chapter XII, P-85, Duke University Press 1930.

(3) The Lost Tribes, A Myth, By Dr. Allen H. Godbey Chapter XII

(4) Cyclopaedia Of Geography By. James Bryce, M.A. ILD., FR.SE.
And Keith Johnson F.R.G.S. 2nd Edition P-25

(5) The Lost Tribes By George Moor M.D. P-145 and 147

(6) تاریخ خورشید جہاں (فارسی) صفحہ نمبر53 مولفہ شیر محمد خان گنڈہ پور

(7) The Travels In Bokhara, By Sir Alexender Brunes, Vol. II P-141

(8) تاریخ یوسف زئی افغان صفحہ نمبر780 - 779 مولفہ اللہ بخش یوسفی

(9)"The Travel In The Moghal Empire "By Mr. Bernier. Publishers:
Archibald Constable, London.... 1891

(10) "The Heritage Of Persia" London 1962 By Richard N. Frey P-285.

(11) Illustrated London News No. 11, 1922.

(12) "The Lost Tribes: A Myth " Chapter XII Duke, University Press 1930
By Dr. Allen H. Godbey, And "Jesus In Rome" P-85

(12-A) "History Of The Jews," Vol. VI, P.11 By Prof. Gra Tez.

(12-B) History of Christianity In India By Reverend
James Hough M.A. Vol.I, P-43

(12-C) "Right Attitude And Action Of Church Towards The Jews" By James
Stenry Lard, P-92.

(13) Letters On A Gourney From Bengal To England By George Forster,
Published By Faulder London. 1908.

(14) Ancient Monuments Of Kashmir P-75 By P. Ramchand Kak.

(15) "Travel In The Moghal Empire Gourney To Kashmir"
P. 430 By Francois Bernier.

(16) "The History Of Christianity In India" Vol 11 P-287 By James Hough.

(17) ماہنامہ درویش دہلی جلد نمبر7 شمارہ نمبر6 صفحہ 18-5 ستمبر1926ء (مدیر خواجہ حسن نظامی)

(17-A) کتاب الہند جلد اول صفحہ نمبر274 مولفہ البیرونی اردو ترجمہ اصغر علی (مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی)

(18) روزنامہ "ویر بھارت" لاہور 30 مارچ 1932ء

(18-A) Jesus Lived In India By Holger Kersten P-188

(19) "Kalhan's Raja Tarangini" Translated By
M. A. Stein Vol II P. 491, Westminster.

(20) "Raja Trangni" Vol 2. P-21

(21) "Raja Trangni" Vol 2. P-349

(22) "Raja Trangni" Vol 2. P-508

(23) "Raja Trangni" Vol 2. P-551

(24) "Antiqueter Of India" By Barnett. P-49

(25) "Antiquities Of India" P-64

(26) "Antiquities Of India" P-84

(27) Antiquities Of India P-50

(28) Antiquities Of India P-371

(29) Antiquities Of India P-143

(29-A) اصول کافی کتاب الحجہ صفحہ 334

(30) لوقا باب نمبر30 آیت نمبر28

مسیحؑ کا سفرِ مشرق

"جو بھی مجھے دیکھتا ہے، اسے تعجب ہوتا ہے کہ میں زندہ ہوں
کیونکہ مجھے تو گرفتار کر لیا گیا تھا (تا کہ قتل کیا جاؤں) اگرچہ
انہوں نے فرض کر لیا تھا کہ وہ مجھے ختم کر چکے ہیں لیکن میں تباہ و
برباد نہیں ہوا کیونکہ میں ان کا بھائی نہیں تھا اور نہ میری پیدائش
ان کی طرح ہوئی۔ انہوں نے مجھے موت کی نیند سلانا چاہا لیکن وہ
اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔" (1)

یہ ایک گیت کے چند بول ہیں "گیت پہلی صدی عیسوی کے ایک مسیحی شاعر نے نظم کیا تھا جو شام کا رہنے والا تھا۔ حضرت مسیحؑ کا یہ عقیدت مند جو ایک بڑا شاعر اور بہت بڑا عالم تھا اس گیت میں جناب مسیحؑ کی زبان سے ایک بہت بڑی تاریخی حقیقت کا اعلان کرتا ہے۔ اس گیت کی دریافت اور اس کے منظر عام پر آ جانے کے بعد یہ حقیت اب تو سورج کی طرح روشن ہو گئی کہ پہلی صدی کے مسیحی جناب مسیحؑ کی حیات آسمانی کے ہرگز قائل نہیں تھے، سرے سے ان کا یہ عقیدہ تھا ہی نہیں اس کے برعکس ان کا عقیدہ یہ تھا کہ جناب مسیحؑ کو صلیب پر چڑھایا ضرور گیا ان کے دشمنوں نے انہیں ہلاک کرنے کی پوری پوری کوشش کی مگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے اور حضرت مسیحؑ صلیبی موت سے محفوظ رہے۔ کم از کم شامی مسیحیوں کا یہی عقیدہ تھا لیکن کچھ عجوبہ پسند مسیحی اس واقعے کو مبالغہ آمیز صورت میں پیش کر رہے تھے اس طرح روایات کے دو دھارے

ساتھ ساتھ بہ رہے تھے۔

ابتدائی مسیحی لٹریچر کی بربادی

آخر کلیسیا نے اس صورتحال کا نوٹس لیا کیونکہ روایات کا یہ دوسرا دھارا جس سے جناب مسیحؑ کی صلیبی موت ثابت نہیں ہوتی تھی اس کے مقاصد کے خلاف بہہ رہا تھا چنانچہ اس نے بڑی سختی سے ایسا تمام لٹریچر ضائع کروا دیا جس سے اس حقیقت کا ثبوت ملتا تھا کہ جناب مسیحؑ آسمان پر نہیں گئے بلکہ صلیب سے زندہ حالت میں اتار لئے گئے تھے اب خود مسیحی مورخ و مصنف بھی اس علمی تشدد کا اعتراف کر رہے ہیں چنانچہ زمانہ حال کے ایک مغربی مسیحی فاضل ایم آئی (Finley) فنلے لکھتے ہیں کہ:-

"یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عیسائیت کے ابتدائی دور میں (جب عیسائیوں کی حکومت قائم ہو گئی) تو اس کے لٹریچر پر سخت پابندی عائد کر دی گئی اور اب وہی لٹریچر ہمارے سامنے موجود ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اب اسی لٹریچر کو باقی رکھا گیا جو کلیسیا کے نقطہ نظر سے مطابقت رکھتا ہے اور اسے ایک ہی رخ سے مرتب کر کے ایک ہی صورت میں محدود کر دیا گیا ہے جبکہ (حقائق پر مبنی) مسیحیت کے ابتدائی لٹریچر کا بہت بڑا حصہ کوڑے کرکٹ میں پھینک دیا گیا جو ضائع ہو چکا ہے۔" (2)

اپنے مقاصد کے خلاف موجود لٹریچر کو ضائع کرنے کا عمل کلیسیا نے کسی ایک ملک تک محدود نہیں رکھا بلکہ یہ علمی تشدد ہر جگہ روا رکھا گیا چنانچہ ایک مغربی مصنف نے برصغیر پاک و ہند کا حوالہ دیتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ "ڈیامپر (Diam Pur) کے کلیسیا کی مجلس عاملہ کے فیصلے سے قبل جو ۱۵۹۸ء کا واقعہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں بائبل کے نسخے شامی زبان میں پائے جاتے تھے یہ نسخے ان تمام روایات سے مالا مال تھے جو نسل در نسل چلی آ رہی تھیں لیکن ۱۵۹۸ء میں کلیسیا نے فیصلہ کیا کہ وہ تمام کتابیں ضائع کر دی جائیں جن کا مواد کسی بھی صورت میں رومی چرچ کے عقائد کے خلاف ہو" (3)

اس طرح معلوم نہیں کتنے ہزار یا کتنے لاکھ ایسی کتابیں ضائع کر دی گئیں جن سے حضرت مسیحؑ کی خدائی اور ان کے آسمان پر جانے کی نفی ہوتی تھی اس لئے اگر آج مسیحی دنیا حضرت مسیحؑ کی حیات آسمانی کی قائل ہے تو اس میں کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے کیونکہ

صدیوں تک اس عقیدے کو پروان چڑھانے کے لئے منظم کوششیں کی گئیں حتیٰ کہ تشدد تک روا رکھا گیا اور ہر ایسی یادگار مٹا دینے کی کوشش کی گئی جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ جناب مسیحؑ بے ہوشی کی حالت میں صلیب سے اتار لئے گئے تھے اور پھر علاج معالجے کے بعد سفر پر روانہ ہو گئے تھے۔ جو بات انتہائی تعجب انگیز ہے وہ یہ ہے کہ اس منظم سختی اور کلیسیا کی طرف سے انتہائی نگرانی کے باوجود وہ لٹریچر باقی کیسے رہ گیا جو رومی کلیسیا کے عقائد کے خلاف ہے اور جس سے پوری صراحت سے ثابت ہوتا ہے کہ جناب مسیحؑ کی موت صلیب پر نہیں ہوئی بلکہ وہ صلیب سے زندہ اتار لئے گئے تھے۔ عجیب بلکہ عجیب تر بات یہ ہے کہ اس لٹریچر نے اتنی پذیرائی حاصل کی اور یہ روایات اتنی مقبول ہوئیں کہ ایشیاء اور یورپ دونوں میں رواج پا گئیں، مسیحی اور مسلمان غرض ہر ملک اور ہر مذہب و مسلک کی کتابوں میں انہوں نے جگہ حاصل کر لی چنانچہ زمانہ قدیم کے ایک بڑے ایشیائی مسلمان مورخ میر اخوند (محمد بن خاوند شاہ بن محمود) نے اپنی مشہور زمانہ کتاب "روضتہ الصفاء" میں حضرت مسیحؑ کے بارے میں بہت تفصیل سے لکھا اگرچہ ان کی بعض روایات ناقابل قبول بھی ہیں مگر وہ روایات جن کی بعض دیگر کتب اور روایات سے تائید ہوتی ہے بلا شبہ قابل قبول ہیں کیونکہ یہ حقائق پر مبنی ہیں۔ "روضتہ الصفاء" کے فاضل مؤلف کے بیان کے مطابق جناب مسیحؑ کو فلسطین سے ہجرت کرنی پڑی تھی۔

مسیحؑ کی فلسطین سے ہجرت

فلسطین سے حضرت مسیحؑ کی ہجرت کے بارے میں بعض تفاصیل بیان کرتے ہوئے یہ بڑا مورخ لکھتا ہے کہ :-

"جناب عیسیٰ ابن مریمؑ کا نام مسیح اس لئے رکھا گیا کہ آپؑ سیر و سیاحت بہت کرتے تھے (اونٹ یا بھیڑوں کے) بالوں سے بنا ہوا عمامہ آپؑ کے زیب سر ہوتا، کرتا بھی اونٹ یا بھیڑوں کے بالوں کا بنا ہوا ہوتا تھا۔ ہاتھ میں عصا لئے ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف سفر کرتے رہتے تھے، جہاں رات پڑتی وہیں رہ پڑتے۔ جنگلی پھل اور چشموں کا پانی آپؑ کی غذا تھی، سفر سواری پر نہیں بلکہ پیدل کرتے تھے۔ ایک بار آپؑ کے شاگردوں نے آپؑ کے لئے ایک گھوڑا خرید لیا تاکہ سفر میں

آرام ملے مگر اس پر آپؑ نے صرف ایک دن سفر کیا دوسرے دن یہ گھوڑا واپس کر دیا کیونکہ اس کے لئے دانے گھاس کا بندوبست نہ ہو سکا تھا۔ اس طرح سفر کرتے ہوئے جناب مسیحؑ اپنے وطن (فلسطین) سے نکل کر نصیبین نامی شہر میں پہنچے" (4)

میر اخوند کی روایت کے مطابق حضرت مسیحؑ نصیبین جانے سے قبل دمشق گئے تھے اس لئے مناسب ہے کہ پہلے حضرت مسیحؑ کے قیام دمشق کا ذکر کر دیا جائے۔

واقعہ صلیب کے بعد جب حضرت مسیحؑ فلسطین سے روانہ ہوئے تو آپؑ کو سب سے زیادہ محفوظ شہر دمشق ہی نظر آیا جہاں بنی اسرائیل کی بہت بڑی تعداد آباد تھی ان میں خاصی تعداد ان یہودیوں کی تھی جو آپؑ سے عقیدت رکھتے تھے۔ مورخین نے صراحت کی ہے کہ دمشق کو اپنے قیام کے لئے منتخب کرنے کی ایک بڑی وجہ حضرت مسیحؑ کے نزدیک یہ تھی کہ یہ شہر رومی حکومت کی حدود سلطنت سے باہر تھا جس نے آپؑ کو صلیب دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان دنوں دمشق پر بادشاہ "ہیروڈ اٹی پاس" (Herod Atipas) کی حکومت تھی جو رومیوں کا سخت دشمن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کثیر تعداد میں یہودی آباد تھے اور بہت آزادی، فارغ البالی اور اطمینان سے زندگی گزارتے تھے۔ حضرت مسیحؑ اس علاقے کو اپنے لئے عافیت کے علاوہ آئندہ سفر کے سلسلے میں بھی محفوظ اور موزوں علاقہ سمجھتے تھے۔ (5)

سفر دمشق

مغرب کے دو مسیحی عالم اور دانشور "رابرٹ گریوز" اور "جوشوا پوڈرو" پوری تلاش و تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جناب مسیحؑ کی صلیبی موت کے بارے میں یہودیوں اور رومی حکومت دونوں کو شبہ پیدا ہو گیا اور ان کی کوشش تھی کہ جناب مسیحؑ کو تلاش کر کے گرفتار کر لیا جائے اور پھر صلیب پر چڑھا کر ہلاک کر دیا جائے چنانچہ انہوں نے اس مقصد کے لئے ساؤل نامی ایک یہودی کی خدمات حاصل کیں ساؤل جناب مسیحؑ اور آپؑ کے ماننے والوں کا جانی دشمن تھا اور مسیحیوں کو سخت ایذائیں دیا کرتا تھا۔ شائد ساؤل اپنے مشن میں کامیاب ہو جاتا اور حضرت مسیحؑ پھر گرفتار ہو کر دوبارہ صلیب پر چڑھا دیئے جاتے مگر ایک ڈرامائی واقعے نے اس منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔ روایت کے

مطابق ساؤل رومی حکومت کے اشارے پر دمشق گیا تھا۔ اس کے ساتھ مسلح دستہ بھی تھا۔ ساؤل بظاہر تو دمشق میں آباد یہودیوں سے مذہبی ٹیکس جمع کرنے کی غرض سے دمشق گیا تھا اور بیت المقدس کے چیف کاہن کا مذہبی حکم نامہ اور کچھ مسلح افراد ساتھ لے گیا تھا۔ مگر درحقیقت ساؤل کو اس غرض سے دمشق بھیجا گیا تھا کہ وہ حضرت مسیحؑ کو تلاش کرے اور مسلح سپاہیوں کی مدد سے گرفتار کرلے تاکہ (یروشلم لاکر) آپؑ کو دوبارہ صلیب دے دی جائے رابرٹ گریوز لکھتے ہیں کہ :۔

"مگر یسوع کو دوبارہ صلیب پر ہلاک کرنے کا منصوبہ اس وقت ناکام ہو گیا جب یسوع سفید لباس میں ملبوس (اپنی قیام گاہ سے) باہر آئے اور ساؤل کا نام لے کر اسے پکارا اس وقت سورج کی تیز روشنی میں ان کے چہرے پر ایسی وجاہت تھی کہ ساؤل کی آنکھیں چندھیا گئیں، اس پر خوف طاری ہو گیا اس وقت یسوع کے ساتھ بھی مسلح افراد کی ایک جماعت تھی پس ساؤل یسوع کے سامنے جھک گیا اور رحم کی درخواست کرنے لگا وہ پوچھ رہا تھا کہ اب اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا (کیونکہ اس نے دیکھ لیا تھا کہ اسے پہچان لیا گیا ہے) اس پر یسوع نے حکم دیا کہ اسے (Judas) (تھوما حواری) کے گھر میں ٹھہرایا جائے اور میرے دوسرے حکم کا انتظار کیا جائے۔" (6)

بعد میں ساؤل کو رہا کر دیا گیا کیونکہ اب وہ حضرت مسیحؑ کا حلقہ بگوش ہو چکا تھا۔ یہ وہی ساؤل ہے جس نے آگے چل کر پولوس کا نام اختیار کیا اور جو موجودہ عیسائیت کا بانی ثابت ہوا چنانچہ "جی سز ان روم" (Jesus In Rome) کے دونوں مسیحی مصنفوں کی تحقیق کے مطابق "اس زمانے میں پولوس دمشق میں موجود تھا اور کرائے کے ایک مکان میں مقیم تھا وہ دو سال تک دمشق میں رہا اور تبلیغ کرتا رہا۔ پولوس نے قسم کھا کر شہادت دی کہ اس نے ۳۵ء میں (یعنی واقعہ صلیب کے ۲ سال بعد) دمشق کے باہر یسوع سے ملاقات کی تھی پولوس نے مزید بیان کیا کہ جہاں تک اسے معلوم ہے یسوع ۶۰ء تک (یعنی واقعہ صلیب کے چھبیس، ستائیس سال بعد تک) زندہ تھے"۔ (6-A)

ہمارے خیال میں مغرب کے ان دو مسیحی مورخوں اور دانشوروں کی اس تحقیق پر مزید کسی تبصرے کی ضرورت نہیں کہ جناب مسیحؑ صلیب سے بچ کر شام چلے گئے تھے اور

کچھ مدت تک شام کے شہر دمشق میں مقیم رہے اور واقعۂ صلیب کے بعد قریباً ۲۷ سال تک تو یقینی طور پر زندہ تھے۔

نصیبین کا سفر

مغربی مورخ مسٹر ہولگر کرسٹن (Holger Kersten) نے فارسی ذرائع خصوصاً "جامع التواریخ" کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت مسیحؑ دمشق میں مقیم تھے کہ آپؑ کو نصیبین کے بادشاہ کا خط موصول ہوا جس میں بادشاہ نے درخواست کی تھی کہ وہ سخت بیمار ہے اس لئے آپ تشریف لا کر اسے بیماری سے صحتیاب فرما دیں۔ حضرت مسیحؑ کسی وجہ سے فوری طور پر نصیبین نہ جا سکتے تھے اس لئے آپؑ نے اپنے شاگرد جناب "تھوما" کو بھیج دیا تھوما نے بادشاہ کا علاج کیا اور ان کے علاج سے بادشاہ صحتیاب ہو گیا (7)

اس کے بعد حضرت مسیحؑ بھی نصیبین تشریف لے آئے مگر کچھ مدت کے بعد وہاں کے لوگ آپؑ کے مخالف ہو گئے، شہرہ آفاق مسلمان مورخ اور عالم امام طبریؒ کی روایت کے مطابق یہ مخالفت اتنی شدت اختیار کر گئی کہ حضرت مسیحؑ کے لئے نصیبین میں رہتے ہوئے منظر عام پر آنا اور لوگوں سے آزادانہ ملنا جلنا بھی خطرے سے خالی نہ رہا۔ (8)

سفر مکہ

مجبوراً" جناب مسیحؑ کو نصیبین سے نقل مکانی کرنی پڑی۔ اس شہر سے روانہ ہو کر آپؑ مکہ گئے۔ بظاہر یہ ایک چونکا دینے والا دعویٰ ہو گا کہ جناب مسیحؑ نے وادیٔ مکہ کا بھی سفر کیا؟ لیکن اس دعوے کے پیچھے ایسے اٹل حقائق ہیں جن کا انکار ممکن نہیں یعنی ایسی روایات جن کے راوی مسلمان مورخ ہیں۔ یہاں اس حقیقت کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے کہ مسیحی علما کی مذہبی روایات اور ان کے موثر و منظم پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر بیشتر مسلمان علما بھی اس عقیدے کے بہت شدومد سے حامی ہو چکے تھے کہ جناب مسیحؑ آسمان پر چلے گئے ہیں اور وہیں تشریف فرما ہیں ان حالات میں کسی مسلمان مورخ اور عالم کا یہ دعویٰ کرنا کہ جناب مسیحؑ مکہ معظمہ گئے اور وہاں روحانی برکات حاصل کیں اس عمارت کو خود گرا دینے کے مترادف ہے جو ان کے اکابر نے تعمیر کی تھی لیکن اس کے باوجود ان مسلمان مورخین نے پوری علمی دیانت سے کام لیا اور جو روایات ان تک

پہنچیں وہ انہوں نے قبول کرلیں کیونکہ یہ مسلمان فاضل مورخ انہیں قابل اعتبار اور ثقہ سمجھتے تھے ورنہ ایک روایت کو غلط اور بے بنیاد سمجھنے کے باوجود اپنی کتابوں میں کبھی درج نہ کرتے چنانچہ شیعہ فرقے کے ممتاز عالم اور فقہ جعفریہ کے بانی ملا باقر مجلسی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ "جناب عیسیٰؑ ابن مریمؑ روحا کے میدان میں آئے تھے اور ان کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ لبیک عبدک و ابن امتک لبیک (اے اللہ میں حاضر ہوں، میں تیرا بندہ اور تیری بندی (مریمؑ) کا بیٹا ہوں میں تیرے روبرو حاضر ہوں) (9)

اس روایت کے درست ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ خود حضورؐ اقدس نے عالم کشف میں حضرت مسیحؑ کو حج بیت اللہ کرتے دیکھا تھا۔ (اخبار مکہ صفحہ نمبر ۳۹ علامہ الازرقیؒ)

اس طرح جناب مسیحؑ نے مکہ معظمہ میں حاضر ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کیا اور حج کی سعادت حاصل کی۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں خانہ کعبہ کو جن تصاویر اور بتوں سے آراستہ کیا گیا تھا ان میں ایک تصویر جناب مسیحؑ کی بھی تھی۔ اگر حضرت مسیحؑ مکہ میں نہ آئے ہوتے اور آپؑ نے خانہ کعبہ کا طواف نہ کیا ہوتا تو مکہ اور اس کے قرب و جوار میں آباد مسیحیوں کو خانہ کعبہ میں ان کی تصویر آویزاں کرنے کی کیا ضرورت تھی پھر زمانہ قدیم کا عربی لٹریچر بھی شہادت دیتا ہے کہ عرب کے مسیحی شعراء یروشلم اور بیت المقدس کی طرح خانہ کعبہ کی بھی عزت کرتے تھے اور "و رب مکہ والصلیب" کہہ کر مکہ اور صلیب دونوں کے رب کی قسم کھایا کرتے تھے (A - 9) اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خود مسیحی شعرا و علماء کے نزدیک جناب مسیحؑ کا خانہ کعبہ سے کوئی تعلق ضرور تھا وہ تعلق یہی تھا کہ مسلمان مورخین اور علما کی تحقیق کی رو سے جناب مسیحؑ نے خانہ کعبہ کا حج کیا تھا۔ دور کیوں جائیے شیخ سعدی کا یہ شعر کہ۔

خر عیسیٰ اگر بمکہ رود   چوں بیاید ہنوز خر باشد

یعنی حضرت عیسیٰؑ کا گدھا مکہ جا کر بھی گدھے کا گدھا ہی رہا۔

اس امر کا ثبوت ہے کہ جناب مسیحؑ نے مکہ کا سفر کیا تھا ورنہ اتنے بڑے اور آفاقی شاعر کو ایک خلاف واقعہ بات نظم کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ مسلمان ادیب ہوں یا شاعر انبیاء کے معاملے میں ہمیشہ محتاط رویہ اختیار کرتے ہیں۔

سفر عراق

تاریخ بتاتی ہے کہ جناب مسیحؑ مکہ معظمہ سے پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے، اس بار

آپؑ نے عراق کا راستہ اختیار کیا۔ راستے میں کہاں کہاں قیام کیا؟ اس کی تفاصیل ابھی مہیا نہیں ہو سکیں البتہ اتنا سراغ ملتا ہے کہ آپؑ اس مقام سے ضرور گذرے تھے جسے اب کربلا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ روایت عالم اسلام کے ایک ممتاز عالم ملا باقر مجلسی نے اپنی کتاب "بحار الانوار" میں بیان کی ہے۔ اس سفر میں جناب مسیحؑ کے ساتھ آپؑ کی والدہ حضرت مریمؑ بھی تھیں چنانچہ یہی فاضل مورخ حضرت علی بن ابی طالب کے عہد خلافت کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ عراق میں ایک مقام پر (حضرت علیؓ کے زمانے میں) مسیحیوں کی عبادت گاہ "مسجد براثا" واقع تھی جب اس عبادت گاہ کا راہب مسلمان ہو گیا تو ایک روز حضرت علیؓ نے نومسلم راہب سے اس عبادت گاہ کے بارے میں کوئی سوال کیا جس کے جواب میں اس نے بتایا کہ اس عبادت گاہ میں جناب عیسیٰ بن مریمؑ اور آپؑ کی والدہ نے بھی نماز پڑھی تھی۔ (10)

گویا جناب مسیحؑ کے سفر عراق کی شہادت مسلمان اور مسیحی دونوں دے رہے ہیں۔ عراق میں جناب مسیحؑ نے کتنی مدت گذاری اور یہاں ان کے معمولات کیا تھے؟ اس کے بارے میں قطعیت سے کوئی بات نہیں کہی جا سکتی البتہ اتنی بات یقینی ہے کہ عراق وہ سرزمین ہے جہاں بنی اسرائیل کو جلا وطنی کے بعد سب سے زیادہ تعداد میں بسایا گیا تھا اور یہیں سے وہ دوسرے ممالک کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ یہاں ان کے بہت سے آثار تھے اس لئے جناب مسیحؑ نے یہاں خاصی مدت گذاری ہو گی اور عراق میں موجود بنی اسرائیل کو تبلیغ فرمائی ہو گی چنانچہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے حواری جناب توما اور برتلمائی نے عراق کے شہر بابل میں تبلیغی فرائض ادا کئے تھے۔ یہ روایت خود مسیحی اہل علم اور مصنفین نے بیان کی ہے اور ظاہر ہے کہ جناب توما حضرت مسیحؑ کے ہم سفر رہتے تھے اس لئے توما کا عراق (بابل) میں تبلیغ کرنا ثابت کرتا ہے کہ جناب مسیحؑ بھی عراق میں موجود تھے اور آپؑ ہی نے جناب توما کو ان علاقوں میں تبلیغ کے لئے بھیجا تھا جہاں آپؑ خود نہیں جا سکتے تھے بلکہ اب تو ایک حوالہ ایسا مل گیا ہے جس سے صریح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جناب توما کے ساتھ خود جناب مسیحؑ بھی بابل گئے تھے چنانچہ "Jesus in Rome" کے مصنفین لکھتے ہیں کہ یسوع کے ایک عزیز ترین شاگرد

نے جو ایک بہت بڑے یہودی پیشوا کا رشتہ دار تھا یسوع سے ملاقات کی ایک جگہ مقرر کر رکھی تھی تاکہ اس جگہ اکٹھے ہو کر وہ یسوع کو سرحد تک پہنچا دے یسوع پہلے "لینڈ آف ناڈ" پہنچے پھر بابل کے شہر "سوسی آنا" میں داخل ہوئے بابل یہودیوں سے بھرا پڑا تھا۔ یسوع جانتے تھے کہ اگر وہ ایک دفعہ وہاں پہنچ گئے تو گرفتاری سے بچ جائیں گے کیونکہ بابل رومی حکومت میں شامل نہیں تھا۔ (11)

مسیحؑ کا کردوں میں قیام

لکمبرگ کے ایک ماہر علم الاقوام کا بیان ہے کہ اس نے مشرقی اناتولیہ (مشرقی ترکی) میں کچھ مدت گذاری۔ یہاں کرد قبائل آباد ہیں ان میں یہ روائت بہت عام تھی کہ جناب مسیحؑ واقعہ صلیب کے بعد ترک وطن (ہجرت) کر کے ترکیہ آ گئے تھے اور ان کردوں کے درمیان کچھ مدت گذاری تھی (12)

اس روایت سے ان روایات کی تصدیق ہو جاتی ہے جن میں واقعہ صلیب کے بعد حضرت مسیحؑ کا عراق و شام اور ترکیہ جانا بیان کیا جاتا ہے۔

ایران کا سفر

عراق سے روانہ ہو کر حضرت مسیحؑ ایران گئے جہاں بنی اسرائیل کی بہت بڑی تعداد صدیوں سے آباد تھی ایران میں حضرت مسیحؑ کی آمد کی ایک معتبر شہادت ممتاز روسی سیاح اور دانشور نکولس نوٹووچ (Nicolas Notovitch) کی ان یادداشتوں سے ملتی ہے جو " The Unknown life of Christ. " (یعنی مسیحؑ کی بھولی بسری زندگی) کے نام سے ۱۸۹۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اصل کتاب فرنچ زبان میں تھی جس کا انگریزی میں ترجمہ مسٹر وائلٹ کرائسپ (Violet Crispe) نے کیا تھا۔ سیاح موصوف (نوٹووچ) ۱۸۸۷ء کے موسم خزاں میں ہندوستان کے شہر بمبئی سے روانہ ہوئے اور لاہور سے ہوتے ہوئے راولپنڈی پہنچے۔ وہاں سے کشمیر، لداخ اور تبت گئے، تبت کے شہر "واکھا" میں ان کی ملاقات بدھوں کے ایک مذہبی پیشوا "لامہ" سے ہوئی جس نے روسی سیاح کو بتایا کہ بدھ لٹریچر میں ایک ایسی شخصیت کا ذکر ملتا ہے جس میں گوتم بدھ کی روح حلول کر گئی تھی

"لامہ" نے اس کا نام "بزرگ عیسیٰ" بتایا اور اسے مہاتما بدھ کا روحانی بیٹا قرار دیا۔ (13)

مسٹر نوٹووچ کو تجسس پیدا ہوا کہ حضرت عیسیٰ اور گوتم بدھ کے مابین کیا تعلق ہو سکتا ہے اور "لامہ" حضرت مسیحؑ کو بدھ کا دوسرا ظہور کیوں قرار دے رہا ہے؟ آخر مسٹر نوٹو وچ نے یہ عقدہ حل کر لیا۔ لداخ کے شہر ہمس (Himis) پہنچ کر ان کی ملاقات چیف لامہ سے ہوئی اس نے بتایا کہ بدھوں میں عیسیٰ کا نام بہت عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ گوتم بدھ کے بعد بہت سے بدھ گذرے ہیں۔ ہمارے لٹریچر میں ۸۴ ہزار دستاویزات ہیں جن میں ان بدھوں میں سے ہر بدھ کی زندگی کے حالات درج ہیں ان میں سے ایک بدھ "عیسیٰ" نامی تھے جنہوں نے ہندوستان آ کر تبلیغ دین بھی کی تھی۔ (14)

مسٹر نوٹووچ ایک حادثے کا شکار ہونے کے بعد بغرض علاج ایک بار پھر لداخ کے شہر ہمس گئے اس بار ان کی رسائی ایک ایسی دستاویز تک ہو گئی جو زمانہ قدیم کے "لاماؤں" نے لکھی تھی دستاویز کے مطابق حضرت مسیحؑ ہندوستان کے علاوہ ایران بھی گئے تھے۔ ایران کی بستیوں میں حضرت مسیحؑ کی نہایت گرمجوشی سے پذیرائی کی گئی اور لوگ ان کی طرف اس کثرت سے متوجہ ہوئے کہ لاماؤں کی اس دستاویز کی رو سے:۔

"وہاں کے مذہبی رہنماؤں کے کان کھڑے ہو گئے اور انہوں نے لوگوں کو منع کر دیا کہ وہ ان (حضرت مسیحؑ) کی باتیں نہ سنیں مگر جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے منع کرنے کے باوجود ایران کے لوگ حضرت مسیحؑ کا پرجوش استقبال کرتے اور بہت احترام سے پیش آتے ہیں اور بدستور ان کی نصائح سنتے ہیں تو ان کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔" (15)

آخر حضرت مسیحؑ کو گرفتار کر کے ایران کے سب سے بڑے مذہبی رہنما کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہاں جو سوال و جواب ہوئے لاماؤں کی دستاویز میں اس کی تفصیل اس طرح درج کی گئی ہے۔

ایرانی پیشوا:۔ تم کس نئے خدا کی بات کرتے ہو؟ اے بد قسمت انسان! کیا تم کو نہیں معلوم کہ بزرگ زرتشت ہی وہ واحد ہستی ہے جسے ذات اعلیٰ (اللہ تعالیٰ) سے رابطہ پیدا کرنے کا حق حاصل تھا۔ کس نے فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ اللہ کے بندوں کے لئے اللہ کے احکام تحریر کرو۔ یہ وہ قوانین ہیں جو زرتشت کو جنت میں دئے گئے تھے۔ تمہیں

ہمارے خدا کی بے حرمتی کرنے کی جرات کیسے ہوئی! اور کیوں ہمارے عقیدت مندوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کر رہے ہو؟

حضرت مسیحؑ:- میں کسی نئے خدا کے متعلق گفتگو نہیں کرتا یہ ہمارا وہ آسمانی باپ ہے جو ہمیشہ سے موجود ہے اور تمام موجودات کے فنا ہونے کے بعد بھی موجود رہے گا۔ وہ ان معصوم لوگوں کو بہت پسند کرتا ہے جو اس قابل نہیں کہ صرف اپنی عقل سے خدا کو پہچان سکیں یا اس کی الوہیت اور روحانی بلندی کو سمجھ سکیں اس لئے میں لوگوں میں اس کے نام کی تبلیغ کرتا ہوں (تا کہ ان معصوم لوگوں کو اپنے رب کا عرفان حاصل ہو سکے) اگرچہ تمہارے غلط عقائد اور مذہبی رسومات نے ان لوگوں کو غلط راستے پر ڈال دیا ہے مگر جس طرح ایک بچہ اندھیرے میں بھی اپنی ماں کے پستان ڈھونڈ نکالتا ہے اسی طرح ان لوگوں نے بھی (میرے ذریعے سے) اپنے واحد باپ کو پہچان لیا ہے جس کا میں پیغمبر بن کر آیا ہوں۔ اس لازوال ہستی نے تمہارے لئے میری زبان سے یہ پیغام دیا ہے کہ سورج کی پرستش نہ کرو یہ اس عالم کبیر کا ایک حصہ (سیارہ) ہے سورج اس لئے طلوع ہوتا ہے کہ کام کے دوران تمہارے اعضائے جسم کو گرم رکھے اور غروب ہو کر وہ تم کو اجازت دیتا ہے کہ تم وہ کام کرو جس کی خاطر میں نے تمہیں پیدا کیا ہے۔

ایرانی پیشوا:- انسان انصاف کے مذہبی قوانین کے سہارے کس طرح زندگی گذار سکتا ہے جب تک اس کی رہبری کرنے والا موجود نہ ہو۔

حضرت مسیحؑ:- جب تک لوگوں کے پاس کوئی فرستادۂ خدا نہیں آتا اس وقت تک ان کی رہنمائی کے لئے وہ قدرتی قوانین کافی ہوں گے جو انسانی فطرت میں ودیعت کر دیئے گئے ہیں۔ انسان کی روح کا تعلق خدا تعالیٰ سے ہوتا ہے اس تعلق کے لئے کسی بت، جانور یا آگ کو واسطہ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں جس طرح یہاں آگ کی پرستش کی جاتی ہے۔ تمہارا عقیدہ ہے کہ ہر شخص کو سورج کی عبادت کرنی چاہئے کیونکہ وہی نیکی اور بدی کی روح ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ تمہارا یہ عقیدہ بالکل جھوٹا اور غلط ہے۔ سورج اپنی ذات کی وجہ سے روشن نہیں ہے بلکہ اس غیر مرئی عظیم خالق کی ذات سے روشن ہے جس نے اسے پیدا کیا۔ اس نے چاہا کہ ایک ستارہ دن کو روشنی دے کر کام کرنے والوں

کو سرگرم رکھے اور انسان کو وقت کی پہچان کرائے سو آفتاب نے روشنی دینا شروع کر دی (یعنی آفتاب تو اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار ہے وہ اس قابل کب ہے کہ اس کی عبادت کی جائے) ابدی روح تو ہر جاندار کی روح ہے تم نیک روح اور بد روح کو تقسیم کر کے گناہ کے مرتکب ہو رہے ہو کیونکہ خداوند تعالیٰ میں اچھائی کے سوائے اور کوئی چیز نہیں (دیکھو !) ایک خاندان کے باپ سے اپنے بچوں کے لئے بھلائی کے سوائے اور کس بات کی امید کی جا سکتی ہے اگرچہ کسی وجہ سے وہ اس کی مخالفت ہی کیوں نہ کرتے ہوں' اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ تم یوم حساب سے ڈرو کیونکہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر خوفناک سزا نازل کرے گا جو معصوم بچوں کو سیدھے راستے سے ہٹا کر گمراہ کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگ سزا پائیں گے جنہوں نے لوگوں کو بصیرت سے محروم کر دیا' صحت مند انسانوں کو وبائی امراض میں مبتلا کر دیا اور ایسی چیزوں کی عبادت کرنے کی تعلیم دی جنہیں اللہ تعالیٰ نے انسان کا مطیع و فرمانبردار بنا کر پیدا کیا تا کہ اس کے کاموں میں اس کی مدد کرے پس تم جن مذہبی عقائد کا شکار ہو یہ تمہاری غلطیوں کا نتیجہ ہیں (افسوس کہ) اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی بجائے تم نے خود ہی جھوٹے خدا پیدا کر لئے۔

حضرت مسیحؑ کی یہ پر معارف گفتگو سن کر آتش پرستوں کے اس پیشوا نے طے کر لیا کہ وہ آپؑ کو کوئی گزند نہیں پہنچائے گا مگر جب رات ہوئی اور لوگ اپنے اپنے بستروں میں سو رہے تھے تو ان لوگوں نے حضرت مسیحؑ کو پکڑ کر فصیل شہر سے باہر نکالا اور پھر ایک سنسان جگہ پر اس خیال سے چھوڑ دیا کہ کوئی درندہ آپؑ کو پھاڑ کھائے گا (16)

یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی حفاظت فرمائی اور جناب مسیحؑ ہر قسم کے گزند سے محفوظ رہے۔

سفر افغانستان

ایران سے روانہ ہو کر جناب مسیحؑ افغانستان کی حدود میں داخل ہوئے قندھار اور کابل میں آپؑ کے حواری جناب توما کی موجودگی ثابت کرتی ہے کہ جناب مسیحؑ نے افغانستان کا سفر اختیار کیا تھا۔ مستند روایات کے مطابق توما حواری شروع سے آخر تک حضرت مسیحؑ کے ہم سفر رہے۔ اگر وہ جناب مسیحؑ سے الگ بھی ہوئے تو تبلیغی مقاصد کے

لئے اور کچھ مدت کے بعد وہ پھر جناب مسیحؑ کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ جناب مسیحؑ کے افغانستان جانے کا ایک بڑا ثبوت وہ چبوترے ہیں جو غزنی اور جلال آباد میں آج بھی موجود ہیں اور "شہزادہ نبی" کے چبوتروں کے نام سے موسوم ہیں ان کا دوسرا نام "یوز آسف کے چبوترے" ہے ان چبوتروں پر کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر جناب مسیحؑ اس ملک میں آباد بنی اسرائیل کو وعظ و تلقین فرمایا کرتے تھے اس لئے یہ چبوترے شہزادہ نبی اور یوز آسف کے نام سے منسوب ہوئے۔ یوز آسف جناب مسیحؑ کا نام تھا (جیسا کہ آئندہ ابواب میں تشریح کی جائے گی)

قندھار اور کابل سے سفر کرتے ہوئے جناب مسیحؑ موجودہ پاکستان کے علاقہ بلوچستان میں داخل ہوئے۔ جدید تحقیق کی رو سے آپؑ نے اس طویل سفر میں برصغیر کی بہت سی ریاستوں اور بعض دیگر علاقوں کا بھی دورہ کیا جن میں سندھ 'ٹیکسلا' راولپنڈی اوڑیسہ اور بنارس شامل ہیں۔ بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب مسیحؑ ہندوستان کی ہمسایہ ریاستوں مثلاً نیپال' تبت (لداخ) اور چین بھی گئے تھے آخر میں آپؑ نے کشمیر جا کر سکونت اختیار کر لی اور پھر اسی سرزمین کو آپؑ کی ابدی خواب گاہ بننے کی سعادت نصیب ہوئی اس اجمال کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

مسیحؑ ٹیکسلا میں

ہندوستان میں جناب مسیحؑ ہمیں سب سے پہلے شمال مغربی ہند کے دارالسلطنت ٹیکسلا میں نظر آتے ہیں اس زمانے میں ٹیکسلا پر بادشاہ گوندافیرس (Gonda Phares) کی حکومت تھی اور اس کا بھائی گاد بھی اس کی طرف سے ایک علاقے پر حکمران تھا عیسوی حساب سے یہ ۲۵ء اور ۵۰ء کا درمیانی زمانہ تھا محکمہ آثار قدیمہ ہند کی سالانہ رپورٹ بھی اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ بادشاہ گوندافیرس ۲۵ سے ۵۰ء تک ٹیکسلا کا حکمراں رہا۔ (17)

بادشاہ گوندا فیرس کو اپنے بھتیجے (راجہ گاد کے بیٹے) ابان (Abban) یا ابانیس (Abbananes) کے لئے ایک نیا محل تعمیر کروانا تھا کیونکہ عنقریب اس کی شادی ہونے والی تھی گوندافیرس نے ایک ہم عصر بادشاہ کے دربار میں اپنا سفیر بھیجا تاکہ وہ اس کے پاس کسی ماہر فن انجینئر کو بھیج دے۔

ان دنوں حضرت مسیحؑ کا حواری توما جو فن تعمیر کا ماہر تھا اس بادشاہ کے پاس مقیم تھا چنانچہ اس نے توما کو ٹیکسلا بھیج دیا۔ توما ٹیکسلا میں تعمیراتی کام کی نگرانی کرتا رہا معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران میں بادشاہ گوندا فیرس توما حواری سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا اور اسے اپنی ایک شہزادی کا (جس کی شادی ہونے والی تھی) اتالیق مقرر کر دیا۔ چھ ماہ میں محل تعمیر ہو گیا کچھ مدت کے بعد جب شادی کی تقریب منعقد ہوئی تو اس میں بڑی بڑی شخصیتوں کو مدعو کیا گیا۔ اس تقریب میں حضرت مسیحؑ بھی شریک ہوئے (18)

حضرت مسیحؑ کی ٹیکسلا میں موجودگی کے بارے میں ایک اور شہادت ملتی ہے یہ ایک فاضل مسیحی محقق کی کتاب ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ:

"ہندوستان کے تمام مقامات پر جہاں جہاں "توما" گیا خدا کا بیٹا (مسیحؑ) اس کے ساتھ رہا۔" (19)

اگرچہ اس روایت میں ٹیکسلا کا ذکر نہیں لیکن توما حواری تو ٹیکسلا میں موجود تھے اور نہ صرف بحیثیت انجنیئر موجود تھے بلکہ شہزادی کے اتالیق کی حیثیت سے بھی موجود تھے اس لئے لازمی طور پر حضرت مسیحؑ بھی ٹیکسلا میں موجود تھے کیونکہ اس روایت کے مطابق ہندوستان کے دوران قیام میں حضرت مسیحؑ اور جناب توما ہر جگہ اکٹھے رہے اس روایت کی تائید مزید مندرجہ ذیل روایت سے ہوتی ہے۔

"پہلی صدی عیسوی کے دوران بادشاہ کوشاں کے حملے کی وجہ سے شمالی ہندوستان میں بڑی افراتفری پھیل گئی چنانچہ حفاظت کی غرض سے توما یسوعؑ اور مریمؑ کو ساتھ لے کر کشمیر کی طرف روانہ ہو گئے" (20)

گویا یہاں بھی حضرت مسیحؑ اور توما اکٹھے تھے اور پہلی صدی عیسوی میں کہ حضرت مسیحؑ کا زمانہ اسی صدی سے شروع ہوتا ہے جب بادشاہ کوشاں نے شمال مغربی ہند پر حملہ کیا جس کا ٹیکسلا مرکز تھا اور سخت ابتری پھیلی تو جناب توما حضرت مسیحؑ اور حضرت مریمؑ کو لے کر کشمیر کی طرف روانہ ہو گئے تاکہ جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہ سکیں۔

مسیحؑ تبت میں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کی جانب حضرت مسیحؑ کا یہ پہلا سفر تھا اس پہلے سفر میں

آپؑ نے کشمیر میں مستقل قیام نہیں فرمایا بلکہ کشمیر کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے اور موجودہ ہماچل دیش سے گذرتے ہوئے آگے کی طرف سفر جاری رکھا۔ حضرت مسیحؑ کے اس سفر کی روداد ہمیں روسی سیاح اور عظیم دانشور مسٹر نکولس نوٹووچ کے سفرنامے میں ملتی ہے۔ نوٹووچ جس کا اس سے قبل بھی ذکر کیا جا چکا ہے کشمیر کے علاوہ لداخ اور تبت بھی گیا تھا وہاں اس نے ایسی دستاویزات دیکھی تھیں جن میں مہاتما بدھ کے ایک غیر ملکی اوتار کا ذکر کیا گیا ہے جو ہندوستان آیا تھا اور بدھوں کے عقیدے کے مطابق گوتم بدھ کی روح اس میں حلول کر گئی تھی جسے بدھ لٹریچر میں "عیسیٰ" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ دستاویزات پالی زبان میں تھیں جو گوتم بدھ کے عہد کی زبان تھی ان کا تبتی زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ مسٹر نوٹووچ نے ان دستاویزات کا فرنچ زبان میں ترجمہ کیا جو انگریزی ترجمہ کی صورت میں اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ ان دستاویزات میں حضرت موسیٰؑ کے زمانے سے لے کر حضرت مسیحؑ کی ولادت اور ان کی ہندوستان میں آمد تک تمام واقعات خاصے تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن ناقص ذرائع معلومات اور زبان کی مغائرت کی وجہ سے اگرچہ بعض واقعات صحیح صورت میں درج نہیں ہو سکے مگر ایک بات بہت غور طلب ہے کہ اگر حضرت مسیحؑ ہندوستان نہیں آئے، انہوں نے بدھوں کی عبادت گاہوں میں جا کر ان کے مذہبی پیشواؤں سے ملاقاتیں نہیں کیں اور بدھ رہنماؤں نے ان میں روحانی کمالات نہیں پائے تو بدھ لٹریچر میں اس عزت و احترام سے ان کا ذکر کیسے شامل کر لیا گیا۔ آخر دنیا کے کسی اور پیغمبر کے بارے میں یہ کیوں نہیں لکھا گیا کہ وہ ہندوستان آیا اور بدھوں کے فلاں پیشوا سے ملاقات کی، صرف حضرت مسیحؑ کی ہندوستان آمد کا ذکر کیوں کیا گیا؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ یقیناً ہندوستان تشریف لائے اور انہوں نے یہاں مختلف شہروں میں زندگی گذاری اور بعض ہمسایہ ممالک کا بھی سفر کیا چنانچہ نوٹووچ کے بیان کی تائید بعض دیگر ذرائع سے بھی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر مسیحی مصنفہ لیڈی میرک (Lady Merrick) اپنی کتاب میں لکھتی ہیں کہ:۔

"(تبت کے شہر) لیہ (Leh) میں کرائسٹ کہانی کے نام سے ایک روایت بہت عام ہے۔ ہمس (Himis) کی بدھ خانقاہ میں ڈیڑھ ہزار سال قدیمی دستاویزات موجود ہیں جن

میں درج ہے کہ یسوع "لیہ" سے گذرے تھے جہاں ان کا پرجوش اور پرتپاک استقبال کیا گیا تھا وہاں کے دوران قیام میں انہوں نے اپنے دین کی تبلیغ بھی کی تھی (21)

مسیحؑ کا سفر اڑیسہ

بدھوں کی دستاویزات کی رو سے حضرت مسیحؑ سندھ، راجپوتانہ اور پنجاب سے ہوتے ہوئے ہندوستان کے صوبہ اڑیسہ گئے تھے جہاں جگناتھ پوری کا مشہور مندر واقع ہے وہاں سے راج گڑھ اور بنارس گئے۔ حضرت مسیحؑ نے ان شہروں میں مجموعی طور پر چھ سال گذارے، آپؑ نے ویشوں اور اچھوتوں کے درمیان رہنا پسند کیا (کیونکہ یہ لوگ ہندو معاشرے کے ستائے ہوئے تھے) یہیں سے حضرت مسیحؑ اور برہمنوں کے درمیان اختلافات کا آغاز ہوا حالانکہ اس سے پہلے بنارس اور ہندوؤں کے دیگر متبرک مقامات کے لوگ ان سے بہت محبت کرتے تھے لیکن جب برہمنوں اور کھشتریوں نے دیکھا کہ حضرت مسیحؑ ویشوں اور اچھوتوں کی طرف بہت زیادہ متوجہ ہو گئے ہیں تو انہوں نے آپؑ کو بتایا کہ برہمنوں کے سربراہ (پروہت) نے ان لوگوں سے رسم و راہ رکھنے سے منع کیا ہے جو برہمن کے پاؤں سے پیدا کئے گئے تھے یعنی ویش اور شودر۔ (22)

انہوں نے حضرت مسیحؑ کو تلقین کی کہ ان نیچ لوگوں سے قطع تعلق کر کے ہمارے (برہمنوں کے) پاس آ جاؤ اور ہمارے ساتھ مل کر دیوتاؤں کی عبادت کرو، حضرت مسیحؑ کو دھمکی دی گئی کہ اگر انہوں نے شودروں کی بستیوں میں رہنا اور ان سے رسم و راہ رکھنا ترک نہ کیا تو انہیں برہمنوں اور کھشتریوں کی دشمنی کا نشانہ بننا پڑے گا مگر حضرت مسیحؑ نے ان کی باتوں کی کوئی پروا نہ کی بلکہ شودروں ہی میں رہنے لگے۔ آپؑ نے برہمنوں اور کھشتریوں کے طرز عمل کے خلاف وعظ و نصیحت کا سلسلہ شروع کیا یعنی انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی سخت مذمت کی اور کہا کہ ان (برہمنوں اور کھشتریوں) نے برتری کے زعم میں اپنے جیسے انسانوں کو انسانی حقوق سے محروم کر رکھا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے جو سب کا (روحانی) باپ ہے اپنے بچوں (مخلوق) میں کوئی تفریق روا نہیں رکھی۔ اس کے نزدیک سب یکساں اور اسے پیارے ہیں آپؑ نے "ویدوں" اور "پرانوں" کو آسمانی کتابیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے معتقدین کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیحؑ

کی صورت میں ایک رہنما اور ہادی بھیج دیا ہے جو لوگوں کی رہنمائی اور ہدایت کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ (یعنی اس کی بعثت کے بعد اب وید اور پران منسوخ ہو گئے) حضرت مسیحؑ نے ویدوں کے ان اشلوکوں کا بھی انکار کیا جن کی رو سے دشنو' سیوا اور دوسرے دیوتا بڑے برہمن کے روپ میں پیدا ہوتے رہتے ہیں (23)

مسیحؑ کا شودروں میں وعظ

اڑیسہ کے شہر جگناتھ پوری اور مضافاتی بستیوں میں گھوم پھر کر حضرت مسیحؑ نے معاشرے کے ستائے ہوئے لوگوں کی ڈھارس بندھائی' انہیں امید کی روشنی عطا کی' بدھ دستاویزات کے مطابق حضرت مسیحؑ نے اپنے سننے والوں کو جو تعلیم دی اس میں کہا گیا تھا:

"لازوال روح (اللہ تعالیٰ) ہر شخص کے حال سے اچھی طرح واقف ہے وہ پوری کائنات کی روح ہے جو اکیلی ہی تخلیق کرتی اور قائم رہتی ہے۔ وہ ذات اپنی مرضی کی خود ہی مالک ہے اس کا کوئی ثانی نہیں۔ اس عظیم خالق کے کاموں میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ وہ تمام قوتوں کا (تنہا) مالک ہے۔ اس نے خواہش ظاہر کی اور دنیا عالم وجود میں آ گئی۔ اس نے پانیوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا اور پھر انہیں زمین کے خشک حصوں کے درمیان تقسیم کر دیا وہی انسانوں کی عجیب و غریب زندگی کا منبع ہے اس نے زمین کو پانی کو' درندوں کو اور ہر اس چیز کو جسے اس نے پیدا کیا انسان کے تابع کر دیا۔ وہ خود لازوال حالت میں موجود ہے مگر ہر چیز کے لئے ایک مدت مقرر کرتا ہے۔ خداوند تعالیٰ کا غصہ جلدی انسانوں کو پکڑ لیتا ہے کیونکہ وہ اپنے خالق کو بھول جاتا ہے اور اپنے پیدا کردہ خیالی تصورات کے تحت اپنے مندروں کو بتوں سے بھر لیتا ہے اور مخلوقات کے ایک انبوہ کی عبادت کرتا ہے اور انہیں خدا تعالیٰ کا نائب قرار دیتا ہے۔ خدا تعالیٰ اپنے بندوں سے اس لئے بھی ناراض ہے کہ انہوں نے بتوں اور دھاتوں کو عزت و احترام دینا شروع کر دیا ہے اور وہ نسل انسانی کی قربانی دیتے ہیں جس میں وہ خود بستے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے اس لئے بھی ناراض ہے کہ انہوں نے اپنے ہی بھائیوں کو روحانی اور جسمانی سکون سے محروم کر رکھا ہے' لیکن وہ خود ہی سکون سے محروم ہو جائیں گے (آخر کار) برہمن اور کھشتری اچھوت بن جائیں گے اور (جنہیں آج اچھوت سمجھا جاتا ہے) ان کے ساتھ وہ

ابدی روح (اللہ تعالیٰ) ہمیشہ رہے گی' قیامت کے دن شودر اور ویش معاف کر دئے جائیں گے کیونکہ انہیں خدا تعالیٰ کی معرفت حاصل ہی نہیں ہو سکی (یعنی انہیں معرفت الٰہی حاصل کرنے سے محروم رکھا گیا) اس کے برعکس ان لوگوں کو سخت سزا ملے گی جو خدائی حقوق کے خود مالک بن بیٹھے ہیں۔" (24)

حضرت مسیحؑ کی اس تعلیم نے برہمنوں کے ستائے ہوئے شودروں اور ویشوں پر بہت اثر کیا اور انہوں نے حضرت مسیحؑ سے پوچھا کہ وہ کس طرح خدا کی عبادت کریں تاکہ آخرت کی نعمتوں سے محروم نہ ہو جائیں؟ آپؑ نے فرمایا کہ بتوں کی پرستش نہ کرو کیونکہ وہ تمہاری بات نہیں سنتے' ویدوں کی طرف بھی توجہ نہ دو کیونکہ سچائی اور غیر سچائی کو ان میں گڈمڈ کر دیا گیا ہے۔ کبھی اپنے آپ کو دوسروں سے افضل و بہتر بنا کر دکھانے کی کوشش نہ کرو۔ اپنے ہمسائے کو دکھ نہ دو' غریبوں کی مدد کرو' کمزوروں کی حمایت کرو کسی کو بھی آزار نہ پہنچاؤ' ایسا وعدہ کبھی نہ کرو جسے ایفا نہ کر سکو۔

سفر ہند کے وقت مسیحؑ کی عمر؟

یہ تعلیم صاف بتا رہی ہے کہ اسے کسی جعل ساز نے نہیں گھڑا ہے بلکہ خدا کے کسی نبی کے دل سے نکلی ہے' اس میں معرفت کے جو اسرار اور روحانیت کے جو رموز بیان کئے گئے ہیں اور جو اخلاقی درس دیا گیا ہے وہ حضرت مسیحؑ جیسے روحانی انسان اور خدا کے برگزیدہ نبی ہی کی زبان پر جاری ہو سکتا تھا۔ اگر یہ تعلیم گوتم بدھ کی ہوتی جو بلاشبہ خدا کے مقدس فرستادہ تھے تو بدھوں کے مذہبی رہنماؤں کو (جنہوں نے اسے قلم بند کیا) کیا ضرورت تھی کہ وہ اسے حضرت مسیحؑ سے منسوب کر دیتے جبکہ اس میں ان کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔ ان کا فائدہ تو اس میں تھا کہ وہ اپنے روحانی پیشوا کی تعلیم کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے مگر وہ تو خود اعتراف کرتے ہیں کہ یہ تعلیم غیر ملکی "عیسیٰ" کی ہے جو ان کے عقیدے کے مطابق عظیم گوتم بدھ کا (روحانی) بیٹا اور اس کا اوتار تھا۔ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ ضرور ہندوستان آئے اور ان علاقوں میں تشریف لے گئے جن کا بدھ دستاویزات میں ذکر کیا گیا ہے کیونکہ ان دستاویزات میں جو باریک در باریک تفصیلات بیان کی گئی ہیں جن میں سے بعض سطور بالا میں بھی درج کی گئی ہیں وہ صاف بتا

رہی ہیں کہ حضرت مسیحؑ کی ان علاقوں میں تشریف آوری ناقابل تردید حقیقت ہے البتہ ان دستاویزات کا ترجمہ کر کے جب فرنچ اور انگریزی میں شائع کیا گیا تو موجودہ مسیحیت کی عمارت کو گرنے سے بچانے کے لئے ان میں بعض جگہ تغیر و تبدل سے کام لیا گیا جس کی ایک مثال درج ذیل ہے۔ تبدیل شدہ دستاویزات کی رو سے:۔

"جناب مسیحؑ کی عمر ۱۳ سال کی تھی کہ آپؑ کو اپنا داماد بنانے والوں کا انبوہ آپؑ کے گھر میں جمع ہونے لگا۔ یہ سب اسرائیلی امیر اور شریف گھرانوں کے لوگ تھے۔ ان میں سے ہر شخص کی خواہش تھی کہ وہ جناب مسیحؑ کو اپنا داماد بنانے میں کامیاب ہو جائے۔ آخر حضرت مسیحؑ ۱۳ سال کی عمر میں عین اس وقت جب کہ آپؑ کی شادی کی رسم ادا ہونے والی تھی چھپ کر گھر سے نکل گئے اور تاجروں کے ایک قافلے کے ساتھ سندھ روانہ ہو گئے۔" (25)

عام عقل کی رو سے بھی اور روحانی نقطۂ نگاہ سے بھی یہ ساری داستان ہی بے اصل اور حضرت مسیحؑ کے بزرگ منصب سے بھی گری ہوئی ہے۔ اول تو اسرائیلی امراء و شرفاء کو کیا ضرورت تھی کہ وہ ۱۳ سال کے اس بچے کو اپنا داماد بنانے کے لئے انبوہ در انبوہ اس کے گھر میں جمع ہوتے جس کی ولادت ہی کو وہ یہ کہہ کر ناجائز قرار دے چکے تھے کہ

يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ۝ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۝ (سورہ مریم آیت نمبر ۲۷، ۲۸)

(یعنی اے مریم تو نے بہت برا کام کیا۔ اے ہارون کی بہن تیرا باپ تو برا آدمی نہ تھا اور نہ تیری ماں فاحشہ تھی (تو نے یہ کیا کیا کہ بغیر باپ کے بچہ پیدا کر دیا)

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ مالی اعتبار اور دنیاوی وجاہت کے لحاظ سے بھی اس وقت تک کوئی صاحب حیثیت آدمی نہ تھے۔ جناب یوسف جنہیں انجیل آپؑ کا باپ (رشتہ کا باپ) کہتی ہے ایک معمولی حیثیت کے ترکھان تھے۔ سوال یہ ہے کہ اسرائیلی امراء اور شرفاء ایک ترکھان کے بیٹے کو اپنی بیٹیاں دینے کے لئے اس قدر بے قرار کیوں ہوتے۔

اس ساری کہانی میں جو چیز سب سے زیادہ خلاف واقعہ اور حضرت مسیحؑ کے مقام و

مرتبہ سے گری ہوئی ہے وہ آپؑ کا چپ چاپ گھر سے نکل جانا ہے۔ کیا اللہ کے برگزیدہ نبی پر یہ صریحاً ظلم نہیں کہ اسے گھر سے پوشیدہ طور پر فرار کروا دیا جائے؟ وہ بھی عین اس وقت جب کہ اس کی سسرال کے لوگ اس کی شادی کی رسم ادا کرنے کے لئے اس کے گھر آئے ہوئے تھے۔ وہ تیرا سالہ مسیحؑ جس کی تعلیم و تربیت وحی الٰہی کے تحت ہو رہی تھی، تربیت بھی اس کی مقدس ماں (حضرت مریمؑ) کر رہی تھی۔ وہ اس تعلیم و تربیت کو ٹھکرا کر محض اس لئے گھر سے نکل جاتا ہے کہ اسرائیلی امرا و شرفاء اسے اپنا داماد نہ بنا لیں۔ حالانکہ رشتے ناطے زور زبردستی سے نہیں خوش دلی اور باہمی رضامندی سے کئے جاتے ہیں۔ اگر حضرت مسیحؑ اس وقت شادی کرنا نہیں چاہتے تھے تو ان اسرائیلی امیروں اور شریفوں سے معذرت کی جا سکتی تھی، چند سال کے لئے اس معاملے کو ملتوی کیا جا سکتا تھا۔ اس میں گھر سے فرار ہونے کی کیا مجبوری تھی۔ پھر یہ حقیقت بھی مد نظر رہے کہ حضرت مسیحؑ جیسے نرم خو، حلیم الطبع اور سلیم الطبع انسان کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ پوشیدہ طور پر گھر سے نکل گئے اور سال دو سال نہیں بلکہ پورے سولہ سال وطن سے ہزاروں میل دور ایران، ہندوستان اور چین کی سیاحت کرتے رہے ادھر وہ مقدس ماں جس نے اتنے طعنوں اور اعتراضات کی بوچھاڑ میں انہیں پالا پوسا وہ بیٹے کی جدائی میں تڑپتی رہیں جبکہ قرآن کریم میں حضرت مسیحؑ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ :۔

وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ۝ (سورہ مریم آیت ۳۲)

(اور اللہ نے) مجھے اپنی ماں سے نیک سلوک کرنے والا بنایا ہے اور اس نے مجھے ظالم اور بدبخت نہیں بنایا)

کیا اپنی مقدس ماں (اور رشتے کے باپ) کو تڑپتا چھوڑ کر اور گھر آئے ہوئے سسرالی رشتہ داروں کے سامنے انہیں شرمندہ کروا کر چپکے سے گھر سے نکل جانا انتہا درجے کا ظلم اور سخت دلی بلکہ بدبختی نہیں؟ حضرت مسیحؑ جیسے برگزیدہ پیغمبر سے اس ظلم اور شقاوت کی توقع نہیں کی جا سکتی بلکہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پس کہانی نویس نے حضرت مسیحؑ کو آسمان پر بٹھانے کے لئے یہ کہانی گھڑی کیونکہ اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت مسیحؑ

واقعہ صلیب کے بعد ایران ، ہندوستان اور چین گئے تھے تو آپؑ کے آسمان پر جانے کا عقیدہ باطل ہوجاتا ہے اس لئے یہ کہانی گھڑی گئی کہ حضرت مسیحؑ جب مشرقی ممالک کے سفر پر روانہ ہوئے تو آپؑ کی عمر تیرہ سال کی تھی۔

مسیحی سیاح کی کہانی

جن مورخوں نے یہ کہانی گھڑی ان میں ایک معتبر نام روس کے مسیحی سیاح اور ممتاز دانش ور "نکولس نوٹووچ" (NICOLAS NOTOVITCH) کا ہے جنھوں نے تبت جا کر ان قدیم دستاویزات کا مطالعہ کیا جو بدھوں کے مذہبی پیشواؤں کی خانقاہوں میں محفوظ ہیں اور جن میں حضرت مسیحؑ کے سفر مشرق کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ مسٹر "نوٹووچ" نے اپنی کتاب کے آخری باب "RESUME" میں اعتراف کیا ہے کہ بدھوں کے ان مذہبی پیشواؤں (لاماؤں) کی دستاویز میں یہ اطلاع درج ہے کہ واقعہ صلیب کے بعد:۔

"حضرت مسیحؑ نے آتش پرست اور بت پرست اقوام میں تبلیغ کی"۔

("THE UNKNOWN LIFE OF JESUS" P . 206,ED.1895)

مسٹر نوٹووچ نے حقائق سے مجبور ہو کر یہ اعتراف تو کرلیا کہ بدھ دستاویز کی رو سے واقعہ صلیب کے بعد حضرت مسیحؑ کا ان ممالک میں جانا ثابت ہوتا ہے جہاں آتش پرست اقوام آباد تھیں لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ ان کا مذہب تو حضرت مسیحؑ کو صلیب پر مار چکا ہے اس لئے اگر یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ جناب مسیحؑ واقعہ صلیب کے بعد آتش پرست اور بت پرست آبادیوں میں تشریف لئے گئے تھے تو اس کی زد تو ان کے مذہبی عقیدے پر پڑے گی اور یہ ساری عمارت ہی زمیں بوس ہو جائے گی پس انہوں نے اس ٹکڑے کا اضافہ کردیا کہ :۔

"معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ اطلاعات واقعہ صلیب کے بعد کے ابتدائی برسوں میں مشہور ہوئیں کیونکہ بدھ لاماؤں کی دستاویزات میں ایک طرف تو اس امر پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا گیا ہے کہ "مسیحؑ جیسے خدا رسیدہ (MAN OF GOD) کو گورنر

پیلاطوس نے صلیب دے کر ہلاک کردیا" اور دوسری طرف انہی دستاویزات میں بیان کیا گیا ہے کہ "واقعہ صلیب کے بعد جناب مسیحؑ نے ان ممالک میں جاکر تبلیغ کی جہاں آتش پرست اور بت پرست اقوام آباد تھیں۔" مسٹر نوٹووچ کہتے ہیں کہ :۔

"بظاہر ان باتوں میں باہم کوئی ربط نہیں اور یہ بے جوڑ ہیں"

(کتاب کا صفحہ نمبر206)

یعنی یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک فوت شدہ شخص کسی ملک یا قوم میں تبلیغ کرنے جائے پس مسٹر نوٹووچ اعتراف کرنے کے باوجود تسلیم نہیں کرتے کہ حضرت مسیحؑ واقعہ صلیب کے بعد آتش پرست اور بت پرست اقوام کو تبلیغ کرنے گئے تھے کیونکہ وہ تو انہیں اس سے قبل ہی مار کر اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچا چکے تھے پس انہیں اس کا ایک ہی حل نظر آیا کہ واقعات کو آگے پیچھے کردیا جائے چنانچہ اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک خوبصورت سہارا لیا اور لکھا کہ :۔

"بدھ لاماؤں کی دستاویزات میں یہ واقعات بے ترتیب ٹکڑوں کی صورت میں بکھرے ہوئے ہیں جنہیں میں نے تاریخی ترتیب کے مطابق لکھ دیا ہے"۔(کتاب کا صفحہ 207)

ترتیب واقعات میں تبدیلی

اس "تاریخی ترتیب" کا سہارا لے کر مسٹر نوٹووچ نے حضرت مسیحؑ کے واقعات زندگی کو اپنے تیار کردہ خاکے کے مطابق آگے پیچھے کرنے کا جواز پیدا کرلیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی ذہنی کشمکش سے ہمیں آگاہ بھی کردیا اور لکھ دیا کہ بدھ لاماؤں کی دستاویز میں یہ ضرور درج ہے کہ واقعہ صلیب کے بعد حضرت مسیحؑ نے آتش پرست اور بت پرست اقوام میں جاکر تبلیغ کی تھی مگر ان (مسٹر نوٹووچ) کے خیال میں اس واقعے کا تعلق صلیب سے پہلے کے دور سے ہے بعد کے دور سے نہیں کیونکہ کوئی شخص فوت ہونے کے بعد دنیا میں تبلیغ کرنے نہیں آتا مسٹر نوٹووچ ان باتوں کو بے جوڑ قرار دیتے ہیں اور لفظ "INCOHERENT" استعمال کرتے ہیں

(جس کے معنی ہیں عدم مطابقت) اس لئے انہوں نے ان میں مطابقت پیدا کردی۔ یہ مطابقت کس طرح پیدا کی؟ ملاحظہ ہو۔

بدھ لاماؤں کی دستاویزات کہتی ہیں کہ حضرت مسیحؑ نے آتش پرست اور بت پرست اقوام میں واقعہ صلیب کے بعد تبلیغ کی تھی، نوٹو وچ لکھتے ہیں کہ میں نے یہ واقعہ حضرت مسیحؑ کی ابتدائی زندگی کے واقعات کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ واقعہ صلیب کے بعد یہ ممکن نہیں کیونکہ حضرت مسیحؑ تو اس وقت دنیا سے جا چکے تھے۔ گویا مسٹر نوٹو وچ نے خود اعتراف کرلیا کہ بدھ لاماؤں کی دستاویز میں یہ اطلاع درج ضرور ہے کہ مسیحؑ نے واقعہ صلیب کے بعد ابتدائی برسوں میں آتش پرست اور بت پرست اقوام میں جاکر تبلیغ کی تھی مگر مسٹر نوٹو وچ اسے درست نہیں سمجھتے حالانکہ واقعہ صلیب سے پہلے جناب مسیحؑ کا ایران، ہندوستان یا چین جانا ثابت ہی نہیں ہوتا، خود مسٹر نوٹو وچ اعتراف کرتے ہیں کہ بدھ لاماؤں کی دستاویزات میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے آتش پرست اور بت پرست اقوام میں تبلیغ واقعہ صلیب کے بعد کے ابتدائی برسوں میں کی تھی۔

(کتاب کا صفحہ نمبر206)

اب ایک سوال حل طلب رہ جاتا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے واقعہ صلیب کے بعد جن دو اقوام میں تبلیغ کی وہ کہاں آباد تھیں؟ مسٹر نوٹو وچ کی کتاب میں ان اقوام کے لئے دو لفظ استعمال کئے گئے ہیں ایک "GUEBRES" یعنی آتش پرست جو در اصل فارسی لفظ "گبر" کی انگریزی شکل ہے۔ دوسرا لفظ "PAGANS" ہے جس کے معنی ہیں "غیر اہل کتاب" یعنی ایسے لوگ جو اہل کتاب نہ ہوں بلکہ مظاہر پرست مشرک اور بت پرست ہوں۔

سب جانتے ہیں کہ آتش پرست جنہیں پارسی بھی کہتے ہیں ایران میں آباد تھے گویا حضرت مسیحؑ واقعہ صلیب کے بعد ابتدائی برسوں میں ایران تشریف لئے گئے تھے اور وہاں آباد آتش پرستوں کو تبلیغ کی تھی۔

بت پرستوں میں تبلیغ

دوسری قوم جسے حضرت مسیحؑ نے صلیب کے بعد تبلیغ کی وہ مظاہر پرست، مشرک اور

بت پرست تھی۔ یہ لوگ ایران سے متصل ملک ہندوستان میں آباد تھے جن کے بتوں کی تعداد لاکھوں بلکہ کروڑوں تک بیان کی جاتی ہے گویا دنیا کی سب سے بڑی بت پرست قوم ہندوستان میں آباد تھی۔ بدھ لاماؤں کی دستاویز اور خود مسٹر نوٹو وچ کی کتاب کی رو سے حضرت مسیحؑ ایران سے ہندوستان تشریف لائے اور یہاں آباد بت پرستوں میں تبلیغ کی جو در اصل ایران کے آتش پرستوں کی طرح بنی اسرائیلی تھے مگر ہندوستان میں آباد بت پرستوں کے زیر اثر بت پرست ہوگئے تھے، یہ وہی لوگ تھے جنہیں حضرت مسیحؑ نے اڑیسہ، بنارس اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں دین کی دعوت دی تھی۔

پس ان شواہد سے ثابت ہوجاتا ہے کہ حضرت مسیحؑ ابتدائی عمر میں ایران، ہندوستان اور چین تشریف نہیں لائے بلکہ واقعہ صلیب کے بعد آپؑ نے یہ سفر اختیار کیا اور ان اطراف میں یہی آپؑ کا پہلا اور آخری سفر تھا۔

مسیحؑ نیپال میں

گزشتہ صفحات میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت مسیحؑ نے برہمنوں اور کھشتریوں کے ہاتھوں ستائے ہوئے شودروں اور ویشوں کی دل جوئی کی، انہیں سہارا دیا اور برہمنوں کی مذہبی اور سماجی اجارہ داری کو چیلنج کیا (بدھ دستاویزات کی رو سے) یہ دیکھ کر گورے پروہتوں (بڑے پنڈتوں) اور فوجی افسروں (کھشتریوں) کو یہ خیال گزرا کہ حضرت مسیحؑ اچھوتوں اور ویشوں کو ان کے خلاف بھڑکا رہے ہیں چنانچہ انہوں نے آپؑ کو قتل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنے کارندے حضرت مسیحؑ کی تلاش میں روانہ کردیئے، مگر اچھوتوں کو برہمنوں اور کھشتریوں کے اس منصوبے کا علم ہوگیا اور انہوں نے حضرت مسیحؑ کو اس سے آگاہ کردیا چنانچہ آپؑ رات کی تاریکی میں جگناتھ پوری کو چھوڑ کر پہاڑوں کی طرف چلے گئے، آگے چل کر اس دستاویز میں بتایا گیا ہے کہ اس کے بعد جناب مسیحؑ نے نیپال کے پہاڑوں کو چھوڑ دیا اور مغرب کی طرف روانہ ہو گئے۔ (26)

گویا جگناتھ سے روانہ ہو کر حضرت مسیحؑ نیپال کے پہاڑوں میں مقیم ہوئے اور پھر

وہاں سے دوسری منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ نیپال میں آپؑ کی سرگرمیوں سے متعلق تفاصیل ابھی سامنے نہیں آئیں نہ ابھی تک یہ معلوم ہو سکا کہ آپؑ کی دوسری منزل کون سی تھی البتہ ایک حالیہ تاریخی دستاویز سے اس چونکا دینے والی حقیقت کا علم ہوا ہے کہ حضرت مسیحؑ لاہور سے بھی گزرے تھے اور کچھ مدت آپؑ نے اس تاریخی شہر میں بھی قیام فرمایا تھا جس کی کچھ تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ یہاں اس امر کی صراحت مناسب ہو گی کہ لاہور آج سے قریباً تین ہزار سال قبل راجہ رامچندر جی کے بیٹے "لوہو" نے آباد کیا تھا ("خلاصۃ التواریخ" صفحہ ۷۴ مولفہ سبحان رائے بٹالوی، جی اینڈ سنز دہلی ۱۹۱۸ء)

مسیحؑ لاہور میں

بنارس ہندوؤں کا متبرک مقام ہے جہاں برصغیر کے کونے کونے سے لوگ یاترا کی غرض سے جاتے تھے اس لئے اس شہر میں قیام کے دوران حضرت مسیحؑ کی ملاقات مختلف علاقوں کے لوگوں سے ہوئی ہو گی ان میں کشمیر، پنجاب اور صوبہ سرحد کے لوگ بھی شامل ہوں گے چنانچہ تاریخ میں لاہور کے ایک برہمن "AJAININ" یعنی اجے نند کا نام آتا ہے جو بنارس کے دوران قیام میں حضرت مسیحؑ سے ملا تھا اور ان سے فیض حاصل کیا تھا پنڈت اجے نند کو حضرت مسیحؑ سے اتنی عقیدت ہو گئی کہ غالباً اس نے آپؑ کو اپنے وطن (لاہور) آنے کی دعوت دی۔ جب حضرت مسیحؑ نیپال سے روانہ ہوئے تو "بدھ لاما" کی دستاویز کی رو سے آپؑ نے مغرب کی طرف سفر کیا تھا اور سب جانتے ہیں کہ بنارس، اڑیسہ اور نیپال تینوں سے مغرب کی طرف لاہور واقع ہے۔ حال ہی میں ایک نئی تاریخی دستاویز منظر عام پر آئی ہے یہ ایک مسیحی مورخ مسٹر لیوی ڈولنگ (Levi Dowling) کی کتاب (The Aquarian Gospel) ہے فاضل مورخ لیوی ڈولنگ کوئی معمولی تاریخ نویس نہیں تھا بلکہ بائبل کا بہت بڑا عالم بھی تھا۔ لیوی ۱۸۴۴ء میں امریکہ کے شہر بیلی ولی (Belle Ville) میں پیدا ہوا۔ وہ اسکاش اور ویلش خاندان کے وزیر کا بیٹا تھا۔ اس نے اوائل عمر ہی میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ ابھی سولہ سال کا تھا کہ تبلیغ کا آغاز کیا اور ۱۸ سال کی عمر میں ایک چھوٹے سے گرجا کا پادری مقرر ہوا۔ بیس سال کی عمر میں امریکی فوج میں بطور پادری شامل ہو گیا، اس کے بعد اس نے علم طب

کا مطالعہ کیا اور تکمیل علم کے بعد چند سال بطور ڈاکٹر پریکٹس کرتا رہا۔ ابھی وہ نوجوان ہی تھا کہ اس نے خواب دیکھا کہ اسے سفید شہر (White City) تعمیر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ سفید شہر سے مراد یہ تھی کہ وہ یسوعؑ کی مقدس زندگی کے واقعات اور حقیقی سرگزشت کو واضح کرے چنانچہ مورخ لیوی نے اس کام میں چالیس سال صرف کئے۔ اس نے یہ مدت تلاش و تحقیق کے علاوہ دعا اور عبادت میں گزاری۔ اس تلاش و تحقیق کے بعد اسے جو کچھ ملا وہ اس نے اپنی تحقیقی دستاویز "دی اکورین گاسپل" کی صورت میں پیش کر دیا۔ گویا وہ صرف ایک دنیادار محقق نہیں تھا بلکہ اپنے مذہب کا بہت بڑا عالم اور کٹر مذہبی مفکر تھا دوسرے الفاظ میں "بنیاد پرست" تھا۔ ایسے کٹر مذہبی عالم اور مورخ کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ دانستہ طور پر اپنے "خداوند" سے کوئی ایسی بات منسوب کرے گا جو اس کے مقدس رتبے سے گری ہوئی ہو گی اس پس منظر میں مورخ لیوی ڈولنگ کی اس تحقیقی دستاویز کا مطالعہ کیجئے۔ دستاویز کی رو سے:۔

حضرت مسیحؑ نیپال سے مغرب کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں آپؑ کو تاجروں کا ایک قافلہ ملا جو تبت سے کشمیر کے راستے لاہور جا رہا تھا، اس قافلے میں بعض ایسے لوگ بھی شامل تھے جو حضرت مسیحؑ سے تبت میں ملاقات کر چکے تھے اور وہاں آپؑ نے جو روحانی انقلاب برپا کیا تھا اس کا بھی مشاہدہ کر چکے تھے۔ اس قافلے کے لوگوں کو بھی حضرت مسیحؑ نے تبلیغ کی۔ قافلے کے لوگ حضرت مسیحؑ سے ملاقات کر کے اور آپؑ کے نصائح سن کر بہت متاثر ہوئے۔ اس تاریخی دستاویز میں بتایا گیا ہے کہ جب قافلے کے لوگوں کو معلوم ہوا کہ حضرت مسیحؑ لاہور جا رہے ہیں اور ان کے پاس سواری نہیں ہے تو انہوں نے اعلیٰ نسل کا ایک اونٹ آپؑ کی نذر کیا، اس پر عمدہ عماری رکھی اور دوسرا ضروری سازوسامان دے کر اپنے ساتھ شریک سفر کر لیا اس طرح حضرت مسیحؑ اپنی زندگی کی طویل ترین مسافرت میں شاید پہلی بار ایک آرام دہ سواری پر بیٹھ کر عازم سفر ہوئے۔

حضرت مسیحؑ جب لاہور پہنچے تو "Ajai nin" (اجے نند) نے بہت سے پروہتوں کی معیت میں آپؑ کا نہایت پرتپاک استقبال کیا اس طرح لاہور کی سرزمین کو خداوند تعالیٰ کے ایک عظیم پیغمبر کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا۔ لاہور میں حضرت مسیحؑ جب تک مقیم رہے "اجے نند" ہی آپؑ کی میزبانی کا فرض ادا کرتا رہا۔ اجے نند کو حضرت مسیحؑ نے

دین کے بہت سے اسرار و رموز سکھائے۔ آپؑ نے اسے بتایا کہ انسان کس طرح آگ، پانی اور زمین کے ماحول پر قابو پا سکتا ہے۔ جناب مسیحؑ نے اجے نند کو وہ روحانی طریقے تعلیم کئے جنہیں اختیار کر کے انسان میں اپنے دشمنوں کو معاف کر دینے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ گناہوں کو دھو ڈالتا ہے۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ حضرت مسیحؑ اجے نند کے ساتھ ایک مندر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ڈیوڑھی کے پاس سے ایک طائفہ گزرا، یہ لوگ کھیل تماشے کر کے اور گا بجا کر اپنی روزی کماتے تھے۔ گانے والوں کا یہ طائفہ مندر کے پاس پہنچ کر رک گیا اور اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگا۔ حضرت مسیحؑ نے اجے نند کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ گانا جو آج تم نے سنا ہے ان خام کار لڑکوں کی اپنی تخلیق نہیں اور نہ اسے ان کی غیر معمولی ذہانت کا شاہکار کہنا درست ہو گا اگر یہ ہزار سال بھی مشق کرتے رہتے تو بھی ساز و آواز میں یہ کمال حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ فرمایا "یاد رکھو تمام چیزیں قانون قدرت کے تسلسل کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ آج سے دس ہزار سال قبل انسان نے پرندوں کی مدھر آوازیں سنی تھیں یہ اس کی پہلی درسگاہ تھی یہیں سے اس نے نغمہ و موسیقی کا شعور حاصل کیا۔" اس کے بعد دستاویز میں بتایا گیا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے ان کے گانے کی تعریف کی اور پھر انہیں بھی تبلیغ فرمائی۔

لاہور کے دوران قیام میں حضرت مسیحؑ نے بہت سے بیماروں کو صحتیاب کیا اور اہل لاہور کو قیمتی نصائح فرمائیں دستاویز کی رو سے "لاہور کے عوام الناس کو اپنے پیغام کی تبلیغ کی" آپؑ نے نصیحت فرمائی کہ اگر تم اپنی زندگی میں کوئی بہتر نتیجہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو ایک دوسرے کی مدد کرو۔ آپؑ نے فرمایا کہ ہم اس لئے امیر نہیں کہ ہمارے پاس بے حساب دولت ہے بلکہ ہماری اصل دولت تو وہی ہوتی ہے جو ہم دوسروں میں بانٹ دیتے ہیں بس وہی ہمارے حساب میں درج ہو گی۔ فرمایا کہ اگر تم مکمل، بھرپور اور مثالی زندگی گزارنا چاہتے ہو تو اپنے آپ کو نوع انسانی کی خدمت کے لئے وقف کر دو اور اپنی زندگی اس طرح گزارو جیسے کمتر طبقے کے لوگ گزارتے ہیں یعنی غربا و مساکین۔

حضرت مسیحؑ نے لاہور میں بہت طویل مدت نہیں گزاری بلکہ کچھ عرصہ قیام کرنے

کے بعد اپنے میزبان اور عقیدت مندوں کو خدا حافظ کہا اور اپنے اونٹ پر سوار ہو کر عازم سفر ہو گئے۔ ۱؎

حضرت مسیحؑ کا ہندوستان یا پنجاب آنا کوئی ایسا واقعہ نہیں جو صرف مورخ لیوی ڈاؤلنگ نے بیان کیا ہو یا کسی کتاب میں پہلی بار درج ہوا ہو بلکہ اس سے بہت پہلے روسی سیاح اور مسیحی دانشور نکولس نوٹووچ بھی حضرت مسیحؑ کے سفر ہند کی نشاندہی کر چکے ہیں جو ۱۸۷۷ء میں تبت اور لداخ گئے تھے۔ انہوں نے "لاسہ" میں موجود بدھ لاماؤں کی یادداشتوں کے حوالے سے لکھا تھا کہ حضرت مسیحؑ سندھ کے راستے پانچ دریاؤں کی سرزمین میں داخل ہوئے تھے۔ اصل الفاظ یہ ہیں:

"And he Crossed The Country of the five rivers ...." ۲؎

گویا مورخ لیوی ڈاؤلنگ نے جو تحقیق پیش کی ہے اس کی ایک اور مستند ذریعے سے بھی تصدیق ہو گی جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت مسیحؑ پنجاب تشریف لائے تھے۔

لاہور سے حضرت مسیحؑ کشمیر تشریف لے گئے جو آپؑ کی آخری منزل تھی۔ اپنی باقی زندگی آپؑ نے اسی جنت ارضی میں گزاری درج ذیل حقائق اس کی تائید کرتے ہیں۔

مسیحؑ کاشمیری

کچھ مدت قبل لندن سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس کے مصنف مسٹر او ایم برک (O. M. Burke) نامی مسیحی سیاح نے یہ انکشاف کیا کہ افغانستان کے صوبے ہرات میں ایک چھوٹا سا فرقہ ہے جو اپنے آپ کو "عیسیٰ ابن مریم ناصری کاشمیری" کا پیروکار کہتا ہے۔ یہ لوگ عیسیٰ ابن مریم کے پیروکار ہونے کے باوجود خود کو مسلمان بھی کہتے ہیں اور ہرات کے بہت سے دیہات میں ان کی آبادیاں ہیں مگر ان کا مرکز شہر ہرات ہے۔۔۔ ایسا

۱؎ "The Aquarian Gospel of Jesus-The christ," by Levi Dowling Ch.37 PP 67-68 Seventh edition, 1920 Published by L.N. Fowler and Company, Ludgate Circus, London, E.C.4

۲؎ "The Life of Saint Issa" Ch: of "the Unknowne Life of Christ" P.145 Published By Butch in Son and Co London (1895)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ زمانہ قدیم میں مشرقی ایران کے یورپی مبلغوں کے زیر اثر عیسائی ہو گئے تھے لیکن جب عربوں نے افغانستان فتح کیا تو مسلمان ہو گئے مگر اپنے پہلے مذہب اور جناب مسیحؑ سے اپنی نسبت پر زور دیتے رہے۔ ان لوگوں کے عقیدے کی رو سے حضرت مسیحؑ صلیب پر وفات پانے سے محفوظ ہے اور:۔

"صلیب سے اترنے کے بعد ان کے دوستوں نے انہیں چھپا لیا اور ہندوستان کی طرف نقل مکانی کرنے میں ان کی مدد کی یوز آسف ہی مسیحؑ تھے۔" (27)

یہ مسیحی مصنف (او' ایم' برک) لکھتا ہے کہ اس فرقے کے موجودہ پیشوا کا نام ابایجیٰ ہے جو اپنے آپ کو حضرت مسیحؑ کی ساٹھویں پشت کا امیر فرقہ قرار دیتے ہیں ان کے پاس (بقول خود) حضرت مسیحؑ کی زندگی کے صحیح حالات محفوظ ہیں اور ایک کتاب بھی ہے جس کا نام "احادیث المسیح" ہے یہ ان کی مقدس کتاب ہے (28)

ہرات میں آباد قدیمی عیسائیوں کے اس فرقے کی نشاندہی جس مغربی سیاح نے کی ہے وہ خود افغانستان گیا تھا اور اس وقت کے امیر فرقہ ابایجیٰ سے ملاقات کر کے ان لوگوں کے عقائد معلوم کئے تھے۔ ان عقائد کی رو سے حضرت مسیحؑ صلیبی موت سے بچ نکلے تھے اور اپنے دوستوں کی مدد سے ہندوستان کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ یہ فاضل سیاح اس حقیقت کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ ابایجیٰ کے فرقہ والوں کا عقیدہ ہے کہ جناب مسیحؑ نے ہندوستان آکر اپنی زندگی کا بڑا حصہ کشمیر میں گزارا چنانچہ وہ کہتا ہے کہ:۔

"اس فرقے کے عقائد کے مطابق جناب مسیحؑ کنعان (فلسطین) سے ترک وطن کر کے اپنے دوستوں کی امداد سے ہندوستان چلے گئے اور وہاں کشمیر نامی علاقے میں سکونت اختیار کر لی۔ اس فرقے کے بانی جناب مسیحؑ کو:۔

"عیسیٰ ابن مریم ناصری کشمیری" (29)

کے نام سے موسوم کرتے ہیں گویا یہ لوگ حضرت مسیحؑ کی دو نسبتوں کا دعویٰ کرتے ہیں اور انہیں درست تسلیم کرتے ہیں۔ ایک نسبت "ناصری" جو ان کے آبائی وطن "ناصرہ" سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری نسبت "کشمیری" جو حضرت مسیحؑ کے وطن ثانی "کشمیر" سے تعلق رکھتی ہے۔

اگر جناب مسیحؑ اپنے وطن فلسطین سے ہجرت کر کے کشمیر نہ گئے ہوتے اور انہوں نے وہاں مستقل سکونت نہ اختیار کر لی ہوتی تو ایک قدیم مسیحی فرقے کے لوگ جناب مسیحؑ کو کبھی "کشمیری" نہ کہتے اور نہ اس فرقے کے قائدین اور سربراہ اس عقیدے پر صدیوں سے قائم ہوتے۔

ہندوؤں کی معتبر کتب کی شہادت

آئیے اب ہندوستان اور کشمیر کی تاریخ سے تعلق رکھنے والی اندرونی شہادتوں پر غور کریں کہ وہ کیا کہتی ہیں؟ ہندوؤں کی قدیم کتاب "بھوشیا مہا پران" ہے جو پنڈت "ستا" نامی ایک ہندو فاضل نے آج سے صدیوں قبل تالیف کی تھی مگر اس میں عہد بہ عہد اضافے کئے جاتے رہے تاکہ اسے زیادہ سے زیادہ Up To Date بنایا جا سکے اسے ہندوستان کی قدیم ترین تاریخ بھی کہہ سکتے ہیں۔ مشہور آریہ اہل قلم مہاشہ لکشمن نے اس کتاب کے مندرجات پر جو تبصرہ شائع کیا تھا اس کا ایک اقتباس:۔

بھوشیا مہا پران کے بیان کے مطابق موسیٰ کے پیرو (یعنی یہودی) ہندوستان کے مخصوص برہمنی علاقوں کے سوائے سارے جگت (ملک) میں پھیلے ہوئے ہیں (اصل الفاظ یہ ہیں)

"سروسوتی ندی کے پوتر برہم ورت کے ماسوا سارا جگت ملچھ اچاریہ موسیٰ کے پیرو کاروں سے بھرا پڑا ہے۔" اس کتاب میں یہ بھی وضاحت موجود ہے کہ عیسیٰ مسیحؑ ہمالہ دیش میں آئے اور انہوں نے اپنے دین کی تبلیغ کی۔ (30)

گویا ہندوؤں کی اس قدیم ترین کتاب سے دو باتیں ثابت ہو گئیں ایک یہ کہ حضرت موسیٰؑ کے پیرو (بنی اسرائیل) ہندوستان کے ایک مخصوص علاقے کو چھوڑ کر سارے ملک میں آباد تھے صرف آباد ہی نہیں تھے بلکہ "بھرے پڑے تھے" یعنی کثیر تعداد میں آباد تھے جنہیں حضرت مسیحؑ اپنی گم شدہ "بھیڑیں" (قبائل بنی اسرائیل) قرار دیتے ہیں اور جنہیں تلاش کرنے کے لئے جانے کا آپؑ نے بار بار عندیہ دیا۔ دوسری حقیقت یہ ثابت ہوتی ہے کہ جناب مسیحؑ بنی اسرائیل کے قبائل کی تلاش اور انہیں تبلیغ کرنے کی غرض سے ہندوستان آئے اور جس علاقے میں آپ نے مستقل قیام کیا "بھوشیا مہا پران" نامی اس کتاب میں اسے "ہمالہ دیش" (ہمالیائی ریاست) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے کیونکہ

کشمیر کوہ ہمالہ کے دامن میں واقع ہے۔

یہ تو ہندوؤں کی قدیم ترین سنسکرت کی کتاب پر ایک آریہ اہل قلم کا تبصرہ تھا آیئے اب سنسکرت کی اصل کتاب کے ایک ورق کا مطالعہ کریں۔ اس ورق کا ترجمہ سنسکرت کے بہت بڑے ہندو فاضل پروفیسر ڈی ڈی کوسامبی (Professor, D. D. Kosambi) نے کیا ہے جو "ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈا منٹل ریسرچ بمبئی" سے وابستہ تھے اس ترجمہ کی رو سے:۔

"ایک روز ساکا (قوم) کا سردار (راجہ) سالواہن کوہ ہمالہ کی بلند چوٹیوں کی طرف گیا جب وہ "ہن" قوم کی سرزمین پر پہنچا (جسے کشان (Kushans) کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے) تو اس طاقتور بادشاہ (سالواہن) نے ایک پاکباز شخص کو دیکھا جو سفید رنگ کا تھا اور سفید ہی لباس میں ملبوس تھا۔ بادشاہ (سالواہن) نے اس سے دریافت کیا کہ "تم کون ہو؟" اس بزرگ نے جواب دیا کہ میں خدا کے بیٹے کے نام سے معروف ہوں جو ایک کنواری کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ میں ملچھ (یعنی غیر ہندوؤں) میں تبلیغ کرتا ہوں اور سچائی پر ثابت قدم ہوں۔ بادشاہ سالواہن نے اس سے مزید دریافت کیا کہ تمہارے مذہب کے کیا اصول ہیں۔ اس بزرگ نے جواب دیا کہ اے عظیم بادشاہ! جب سچائی کا خاتمہ ہو گیا اور غیر ہندوؤں (یعنی بنی اسرائیل) میں اخلاقی قدریں دم توڑ گئیں تو ان برائیوں کے تدارک کے لئے میں مسیحا بن کر آیا۔" (31)

سنسکرت کی عبارت میں مصنفین نے حاشیہ آرائی بھی کی ہے۔ بعض جگہ ان کی نگاہ مطالب تک نہ پہنچ سکی اور انہوں نے اپنے ذاتی خیالات کی آمیزش کر کے ابہام پیدا کر دیا۔ ایسا ہی ایک مقام وہ ہے جہاں حضرت مسیحؑ کو "اِیسا مسی" کے نام سے متعارف کروایا گیا مگر اس ورق کے فاضل مترجم پروفیسر "ڈی ڈی کوسامبی" نے ایک وضاحتی نوٹ لکھ کر آئینے کا سارا گرد و غبار صاف کر دیا۔ موصوف لکھتے ہیں کہ:۔

"اس بیان کا انداز مذہبی داستانوں جیسا ہے اس میں جس شخصیت کو "اِیسا مسی" کا نام دیا گیا ہے وہ دراصل واضح طور پر یسوع مسیحؑ ہی ہیں" (32)

خلاصہ بحث

گویا خود غیر متعصب مسیحی مورخوں، ہندو اور بدھ فاضلوں اور بہت سے مسلمان مورخوں

اور مذہبی دانشوروں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ حضرت مسیحؑ کو صلیب پر چڑھا کر ہلاک کرنے کی کوشش ضرور کی گئی مگر یہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکی اور حضرت مسیحؑ نہ صرف صلیبی موت سے محفوظ رہے بلکہ اپنے دوست اور عقیدتمندوں کی مدد سے ترک وطن کر کے بحفاظت دمشق پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہاں سے نصیبین، پھر مکہ معظمہ، وہاں سے بابل و نینوا سے ہوتے ہوئے آپؑ ایران تشریف لائے۔ ایران میں آپؑ کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ یہاں بھی آپؑ نے تبلیغ و ہدایت کا کام جاری رکھا۔ یہاں سے افغانستان اور افغانستان سے موجودہ پاکستان کے شہر ٹیکسلا ہوتے ہوئے جناب مسیحؑ ہندوستان کے صوبہ اڑیسہ تشریف لے گئے۔ اڑیسہ اور اس کے بعد بنارس میں آپؑ نے قریباً چھ سال گزارے اور یہاں آباد بنی اسرائیل میں تبلیغ کی۔ برہمنوں اور کھشتریوں نے حضرت مسیحؑ کی شدید مخالفت کی کیونکہ آپؑ ویشوں اور شودروں کی حالت زار سے بہت متاثر ہوئے تھے اور ان پر شفقت فرماتے تھے حضرت مسیحؑ کا یہ طرز عمل اونچی ذات کے ان ہندوؤں کو ناگوار گزرا اور وہ آپؑ کو قتل کرنے کے درپے ہو گئے۔ آخر آپؑ وہاں سے نیپال چلے گئے، نیپال سے تبت اور تبت سے لاہور تشریف لے گئے۔ حضرت مسیحؑ کی آخری منزل کشمیر تھی جہاں بنی اسرائیل کی سب سے بڑی تعداد آباد تھی۔ یہاں کے حکمراں راجہ سالواہن نے حضرت مسیحؑ سے سوال کیا کہ آپ کون ہیں اور آپ کا مذہب کیا ہے؟ سنسکرت کی قدیم ترین کتاب "بھوشیا مہاپران" کی رو سے آپؑ نے جواب دیا کہ "میں غیر ہندوؤں کے ملک سے آیا ہوں، ایک کنواری کے بطن سے پیدا ہوا ہوں اور سچائی کی تبلیغ کرتا ہوں"۔

یہ بہت غور کا مقام ہے۔ حضرت مسیحؑ کا یہ بیان سنسکرت کی ایک قدیم کتاب میں درج ہے۔ اگر جناب مسیحؑ کشمیر نہیں گئے اور وہاں کے حکمراں سے آپؑ کی گفتگو نہیں ہوئی تو صدیوں پرانے ایک غیر عیسائی مورخ کو یہ واقعہ اپنی کتاب میں درج کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس میں اس کا کیا مفاد تھا۔ یہ تو اس وقت کی بات ہے جب اسلام بھی دنیا میں نہیں آیا تھا اور نہ مسیحیت کو غلبہ حاصل ہوا تھا۔ پھر سنسکرت کے اس مورخ کو کیسے معلوم ہو گیا کہ دنیا میں ایک شخص ایسا بھی گزرا ہے جو کنواری کے بطن سے پیدا ہوا تھا، ایک غیر ملک سے کشمیر آیا تھا، خود کو "مسیح" یا "مسیحا" کہتا تھا اور دعویٰ کرتا تھا کہ وہ راستی کا مبلغ ہے۔ اس سے پوری طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت مسیحؑ واقعہ صلیب کے بعد ہندوستان تشریف لائے

اور کشمیر آپؑ کی آخری منزل تھی۔

انجیل میں تحریف کا تازہ انکشاف

یہ باب لکھا جا چکا تھا کہ ایک بہت ہی تلخ حقیقت کا انکشاف ہوا۔ اس انکشاف کا تعلق انجیل میں تحریف سے ہے، تحریف بھی ایسی جس سے حضرت مسیحؑ کی روداد حیات کو یکسر تبدیل کرنے اور آپؑ کا مقدس مشن تباہ کرنے کی کوشش کی گئی اس کا مختصر سا جائزہ ملاحظہ فرمایئے۔

یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انجیلیں مرتب کرنے والوں نے ان میں وقتاً "فوقتاً" رد و بدل کئے تاکہ لوگ ان حقائق تک نہ پہنچ جائیں جو پادریوں کے مفادات کے خلاف تھے اور جن پر وہ پردہ ڈالنا چاہتے تھے۔ بعض مقامات پر تو ایسی عبارتوں کو سرے سے انجیل میں سے نکال ہی دیا گیا اس کی ایک مثال مرقس کی انجیل ہے، اس کے آخری صفحے کی ایک اہم ترین عبارت حذف کر دی گئی جو پہلے مرقس کے نسخے میں موجود تھی۔ اس علمی بد دیانتی کی نشاندہی بائبل کے شہرہ آفاق عالم "سی آر گریگوری" (C.R.Gregory) نے کی ہے۔ گریگوری بائبل کا اتنا بلند پایہ، مسلم اور معتبر عالم تھا کہ اس کی بات کو رد کرنے کی کوئی شخص آسانی سے جرات نہیں کر سکتا۔ مسٹر گریگوری نے مرقس کی انجیل کی جن آیات کے بارے میں نشاندہی کی ہے وہ درج ذیل ہیں۔

"اور مختصرا" ان تمام امور کا اعلان کر دیا گیا جو پطرس سے متعلق تھے۔
انہوں نے (یسوع کی تعلیم) کو پھیلایا۔
اور اس کے بعد یسوع مشرق سے ظاہر ہوا۔
اور (اپنے شاگردوں کو) مغرب تک بھجوایا
ان کے ذریعے (یسوع کی) پاک اور سچی باتیں پہنچائی گئیں جو ابدی نجات کا باعث تھیں آمین۔" (33)

"The Fifth gospel" P.168 by Prof : Fida Hassnain. Published y Dastgir Publicatons Dastgir Hous Sirinagar,Kashmir. (1988)

ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ نے پطرس کو اپنے نائب کے طور پر مقرر اور ان کے بارے میں شاگردوں کو تمام ضروری ہدایات دیدیں اس کے بعد حضرت مسیحؑ ا

طویل سفر پر روانہ ہو گئے اور پھر مشرق میں ظاہر ہوئے چونکہ حضرت مسیحؑ کو آسمان پر بٹھایا جا چکا تھا اس لئے اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ واقعہ صلیب کے بعد حضرت مسیحؑ مشرق کی طرف ہجرت کر گئے تھے اور وہیں سے ظاہر ہوئے تو موجودہ مسیحیت کی ساری عمارت زمیں بوس ہو جاتی اس لئے مرقس کی انجیل سے یہ عبارت ہی حذف کر دی گئی لیکن بائبل کے عالم مسٹر سی آر گریگوری کی نشاندہی کے بعد اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ عبارت ابتدا میں انجیل کا حصہ تھی جو اس امر کا ثبوت ہے کہ حضرت مسیحؑ واقعہ صلیب کے بعد ہجرت کر کے مشرق کی طرف آ گئے تھے، اگر اس عبارت کا یہ مفہوم نہیں تو اسے انجیل سے کیوں حذف کیا گیا کہ:۔

"اور اس کے بعد یسوع مشرق سے ظاہر ہوا۔"

حوالہ جات

(1) "The LOST Books of The Bible" (The World Publishing Company New York 1944 Second Part Forgotten Books Of Eden)
The Odes of, Solomon, Ode verses 14,15

(2) "Aspects Of Antiquity" By Mi. Finley-London 1968, P-190

(3) "Early Spread of Christianity" By Mingana Ron-Gmans Green And Company 1926, P-67

(4) "روضتہ الصفا" مولفہ محمد بن خاوند شاہ بن محمود المعروف میرا خوند جلد نمبر1 صفحہ نمبر130

(5) "Jesus In Rome" By Robert Graves And Joshua Podro (Cassell And Company LTD London, P-30

(6) "Jesus In rome", P-26, 27

(6-A) "Jesus In Rome", P-37

(7) "Jesus Lived in India" By Holger Kersten P-179

(8) تفسیر ابن جریر جلد نمبر3 صفحہ 197

(9) بحار الانوار جلد نمبر5 صفحہ 328

(9-A) "عربستان میں مسیحیت" مولفہ پادری سلطان محمد پال صفحہ 13 مطبوعہ ریلیجس بک سوسائٹی لاہور (1945)

(10) بحار الانوار جلد نمبر5 صفحہ 331

(11) "Jesus In Rome", P-14

(12) "Jesus Lived In India," P-179

(13) "The Unknown Life of Christ" By Nicolas, Notovitch, Translated From The French By Violet Crispe London: Butchinson and Co. 34, Pater Noster Row E.C. 1895 P-52, 53

(14) "The Unknown Life Of Christ." P-120, 121

(15) "The Unknown Life of Christ" P-161

(16) "The Unknown Life of Christ P-162 to 167

(17) محکمہ ء آثار قدیمہ ہند کی رپورٹ 1903ء - 1902ء صفحہ 167

(18) "Early History of India" By V.A. Smith P-219

(19) The Kingdom of Christ By Peter Bamm (London, 1959) P-223

(20) "TOMB OF YUZ-ASAPH." " A TREATISE BY PROF : FIDA HASSNAIN . (SRINAGAR)

(21) "In The World's Attic" By Lady Henriettas Merick P-215

(22) "The Unknown Life of Christ", P-146

(23) "The Unknown Life of Christ", P-146, 148

(24) "The Unknown Life of Christ," P-148-151

(25) "The Unknown Life of Christ," P-144 and Jesus Died In Kashmir", P-16

(26) "The Unknown Life Of Christ," P-153

(27) "Among the Dervishes" By O.M. Burke (London 1973) P-12

(28) "Among The Dervishes," P-12

(29) "Among The Dervishes" P-12

(30) بھوشیا مہاپران پرتی سرگ پرب کھنڈا ادھیائے نمبر 5 اشلوک نمبر 30 بحوالہ بھوشیا پران کی الوچنا شائع کردہ آریہ لیکھک مہاشہ لکشمن

(31) "Jesus In Rome" P-76, 77

(32) Jesus In Rome P-77

(33) "The Fifth Gospel" P.168 By Prof. Fida Hassnain Published By Dastgir Publications Dastgir House Siri Nagar Kashmir (1988)

مسیحؑ کا سفرِ آخرت

"میرے دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آگیا ہے۔ میں جس جگہ فوت ہو جاؤں مجھے وہیں دفن کر دینا۔ میں نے جو احکامات دیئے ہیں ان پر عمل کرنا۔ سچائی کا راستہ کبھی نہ چھوڑنا" ------ یہ کہہ کر اس نے اپنا سر شمال کی طرف کر لیا اور منہ مشرق کی طرف اور چند لمحوں کے بعد اپنی جان اپنے اللہ کے سپرد کر دی۔

حضرت مسیحؑ کے سوانح نگاروں اور خود انجیل نے جناب مسیحؑ کی زندگی کے صرف دو ادوار کا ذکر کیا۔ ایک ان کا بچپن اور ایک جوانی اس کے بعد انہیں مار کر آسمان پر چڑھا دیا، لیکن ان ہی مسیحی علما اور دانشوروں میں کچھ ایسے فاضل محقق بھی تھے جن کے ذہن تعصب اور تنگ نظری سے پاک تھے اس لئے تلاش و تحقیق کے بعد جب ان پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ حضرت مسیحؑ نے طویل عمر پائی تو انہوں نے اپنی طبعی دیانتداری کی وجہ سے اس کا اظہار کرنے سے گریز نہیں کیا۔ ان فاضل مورخوں اور دانشوروں میں سے ہم دو اصحاب کا حوالہ دینا چاہتے ہیں ایک ممتاز روحانی پیشوا بشپ اری ناس (Irenaus) اور دوسرے ڈاکٹر اڈولف ہارنیک (Dr. Adolf Harnaek) چنانچہ بشپ اری ناس نے تو بہت صراحت سے لکھا کہ :-

مسیحؑ بڑھاپے تک زندہ رہے

"لارڈ (یسوع) نے زندگی کا ہر دور دیکھا' وہ شیر خواروں کے لئے شیر خواری کے دور سے گزرا' بچوں کے لئے اس نے بچپن کا دور دیکھا' نوجوانوں کو مثالی نمونہ دکھانے کے لئے وہ نوجوانی کے دور سے گزرا اور انہیں پاکیزگی کی تعلیم دی عمر رسیدہ لوگوں کے درمیان اس نے ایک (عمر رسیدہ) ہادی اور مکمل انسان کی حیثیت سے زندگی گزاری وہ راستی کی سربلندی کے لئے جدوجہد کرتا رہا (گویا وہ ہر دور کے لوگوں کے لئے مکمل نمونہ تھا) یہاں تک کہ موت سے ہمکنار ہو گیا۔" (1)

دوسرا حوالہ ڈاکٹر اڈولف کا ہے جو تلاش و تحقیق اور غور و فکر کے بعد آخر یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہو گئے کہ:۔

یسوع یقیناً فوت ہو گئے (ہوں گے) انہوں نے پیدائش سے بڑھاپے اور موت تک انسانی زندگی کا ہر دور دیکھا اور حالات کا مقابلہ کیا (ہو گا)۔" (2)

گویا یہ دونوں فاضل محقق اور دانشور جو مسیحی تھے یہ واضح نظریہ رکھتے تھے کہ حضرت مسیحؑ نے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک زندگی کے سارے دور دیکھے اور پھر موت سے ہمکنار ہوئے۔ ان کے اس نظریے کی ٹھوس بنیاد ہے یہ بنیاد عقلی ہونے کے علاوہ دینی بھی ہے ورنہ دین کا سارا نظام تہ و بالا اور برباد ہو جائے۔ پیغمبر انسانی زندگی کے ہر دور کے لئے کامل نمونہ لے کر آتا ہے۔ اگر وہ صرف ایک یا دو ادوار کے لئے نمونہ دے کر دنیا سے چلا جائے تو گویا اس کا مشن نامکمل رہا' اگر حضرت مسیحؑ جوانی میں دنیا سے چلے گئے تو ان کی قوم کے لوگ صرف بچپن اور جوانی کے بارے میں ان سے رہنمائی حاصل کر سکے انہیں کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ ادھیڑ عمر اور بڑھاپے میں کس طرح زندگی گزارنی چاہئے کیونکہ ان کا پیغمبر اس کا عملی نمونہ دکھائے بغیر ہی آسمان پر جا بیٹھا اور انہیں تاریکی میں ٹامک ٹوئیے مارنے کے لئے چھوڑ گیا۔ اگر ایسا ہوا تو وہ حقِ پیغمبری ادا کرنے میں ناکام رہا۔ اگر غور کیا جائے تو اس کی زد تو خود اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بے عیب پر پڑتی ہے پس تسلیم کرنا

پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیحؑ کو ان کی قوم کے لئے مکمل نمونہ بنا کر بھیجا۔ آپؑ نے بچوں' نوجوانوں پختہ عمر اور بوڑھوں یعنی ہر عمر کے لوگوں کے لئے زندگی گزارنے کا عملی نمونہ پیش کیا۔ یہی وہ حقیقت ہے جو بہت سے مسیحی مورخ اور دانشور بھی اب بلا جھجک بیان کر رہے ہیں۔ اس طرح قرآن حکیم کے اس ارشاد عظیم کی تائید و تصدیق ہو رہی ہے کہ:۔

ویکلم الناس فی المھد و کھلا الخ ○ (آل عمران آیت نمبر ۴۶)

یعنی وہ (مسیحؑ) جھولے (کم سنی) اور بڑھاپے (یا ادھیڑ عمر میں) بھی کلام کرے گا۔

گویا حضرت مسیحؑ نے مھد (کم سنی کی عمر) سے لے کر کھل (بڑھاپے) کی عمر تک کلام کر کے بتا دیا کہ آپؑ نے زندگی کا ہر دور دیکھا اور ہر دور کے لئے آپؑ نمونہ لے کر آئے تھے۔ قرآن حکیم کے مندرجہ بالا ارشاد میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن اگر وہ ۳۳ سال کی عمر میں فوت ہو گئے یا آسمان پر جا بیٹھے تو کھل (ادھیڑ عمر) میں تو کلام نہ کر سکے۔

مسیحؑ کی اہلی زندگی

اب ہم ایک ایسے موضوع کی طرف آتے ہیں جو اس سلسلے کا سب سے زیادہ نازک اور پیچیدہ موضوع ہے یعنی حضرت مسیحؑ کی اہلی زندگی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت مسیحؑ کنوارے ہونے کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اگر یہ درست ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ حضرت مسیحؑ کی قوم اپنے نبی سے اہلی زندگی کا کوئی نمونہ حاصل نہ کر سکی اور اسے معلوم نہ ہو سکا کہ انسان کو ایک اچھا شوہر اور اچھا باپ بننے کے لئے کس طرح زندگی گزارنی چاہئے۔ اس اعتراض سے بچنے کے لئے یہ مضحکہ خیز موقف اختیار کیا گیا کہ جناب مسیحؑ اپنی دوسری زندگی (بعثت ثانی) میں شادی کریں گے اور ان کے اولاد ہو گی دوسری بعثت سے یہ لوگ آسمان سے جناب مسیحؑ کی واپسی مراد لیتے ہیں مگر یہ دیومالائی داستان تو اب ایک بے سروپا کہانی بن چکی ہے۔ جب حضرت مسیحؑ آسمان پر گئے ہی نہیں تو واپس کہاں سے آئیں گے۔ ان غلطی خوردہ لوگوں کو "دوسری زندگی" (بعثت ثانی) کے الفاظ نے مغالطے میں ڈال دیا۔ دراصل یہاں بعثت ثانی سے مراد واقعہ صلیب کے بعد کی

زندگی ہے کیونکہ یہ ایک نئی زندگی تھی جو حضرت مسیحؑ کو عطا کی گئی اب ہم اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل بیان کرتے ہیں:۔

انجیل اور تاریخ دونوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مریم مگدلینی نام کی ایک خاتون حضرت مسیحؑ کے بہت قریب تھیں جب آپؑ کو صلیب پر چڑھایا گیا اس وقت بھی وہ موجود تھیں پھر جب آپؑ کو عارضی قبر میں رکھا گیا اس وقت بھی وہ حسرت بھری نظروں سے یہ دلدوز منظر دیکھ رہی تھیں۔ "سبت" گذرنے کے بعد جو خاتون سب سے پہلے حضرت مسیحؑ کی قبر پر پہنچیں وہ یہی مریم مگدلینی تھیں۔ جناب مسیحؑ کے ایک ہم عصر سوانح نگار نے لکھا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے ایک دوست جناب "لعزر" (LAZARUS) کی ہمشیرہ جن کا نام مریم تھا حضرت مسیحؑ کی طرف رغبت رکھتی تھیں اور جناب مسیحؑ بھی کہ ابھی منصب نبوت پر فائز نہیں ہوئے تھے اس نیک اور پاکیزہ کردار خاتون سے شادی کرنے کے خواہشمند تھے مگر السینی فرقے کے بزرگوں نے جس سے حضرت مسیحؑ بھی وابستہ تھے دونوں کو شادی کرنے سے روک دیا تھا کیونکہ حضرت مسیحؑ تبلیغ و تلقین کا جو کام (نبوت سے قبل) کر رہے تھے شادی اس میں حارج ہو رہی تھی انہیں قریہ قریہ اور شہر شہر سفر کرنا پڑتا تھا وہ بھی پیدل، ان حالات میں بیوی بچوں کو ساتھ رکھنا ممکن نہیں تھا اس لئے حضرت مسیحؑ نے ایک صاحب کردار اور باعظمت انسان کی طرح اپنے جذبات پر قابو پایا اور مریم سے شادی کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ (3)

منصب نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد ایک دور ایسا آیا جب آپؑ نے شادی کی اور بعض روایات کے مطابق مریم مگدلینی آپؑ کی رفیقہ حیات بنیں۔ واقعہ صلیب کے بعد جب آپؑ ترک وطن کر کے مشرق کی طرف روانہ ہوئے تو مریم مگدلینی آپؑ کے ساتھ تھیں مگر موجودہ پاکستان کے مقام "مری" کے قریب پہنچ کر ان کا انتقال ہو گیا۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اب تو مغرب کے بہت سے مسیحی دانشور بھی تسلیم کرنے

لگے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کی شادی ہو چکی تھی اور واقعہ صلیب کے بعد ان کی بیوی ان کے ہمراہ فلسطین سے ہجرت کر گئی تھیں چنانچہ چند سال قبل لندن کے ممتاز جریدے "ٹائمز" نے ایک فکر انگیز اور حقیقت افروز تحریر شائع کی تھی۔ صاحب تحریر مسیحی دانشور ہیں۔ موصوف لکھتے ہیں کہ:۔

"کٹر مسیحی خیال کا کوئی شخص تو اس نظریے کو درست تسلیم نہیں کرے گا جو فلپ کی انجیل میں بیان کیا گیا ہے کہ مریم مگدلینی حضرت مسیحؑ کی شریک حیات تھیں مگر یہ تو ظاہر ہے کہ واقعہ صلیب کے بعد دو خواتین حضرت مسیحؑ کے ساتھ شریک سفر ہیں (اور دونوں کے نام مریم تھے) ان میں سے ایک مریم جناب مسیحؑ کی والدہ تھیں اور دوسری مریم کے بارے میں غالب خیال یہ ہے کہ وہ حضرت مسیحؑ کی رفیقہ حیات مریم (مگدلینی) تھیں۔ (3-A)

ایک قدیم فارسی کتاب "نگارستان کشمیر" کی روایت کے مطابق حضرت مسیحؑ نے ایک شادی کشمیر میں کی تھی چنانچہ مصنف کتاب لکھتا ہے کہ کشمیر کے راجہ نے جو حضرت مسیحؑ کا بہت قدر دان تھا ایک روز آپؑ سے عرض کیا کہ آپؑ تنہا زندگی گذار رہے ہیں آپ کی خدمت کے لئے ایک عورت ضرور آپؑ کے پاس ہونی چاہئے اس نے کچھ عورتیں منتخب کر کے جناب مسیحؑ کو پیش کیں مگر آپؑ نے بہت بے پروائی سے جواب دیا کہ مجھے کسی عورت کی ضرورت نہیں اور نہ میں اسے پسند کرتا ہوں کہ کسی عورت کو زبردستی میری خدمت پر مجبور کیا جائے لیکن راجہ مسلسل اصرار کرتا رہا آخر آپؑ نے ایک عورت (اس کی رضا مندی حاصل کرنے کے بعد) قبول کر لی تاکہ وہ آپؑ کا کھانا پکا دیا کرے۔ کپڑے دھو دیا کرے اور گھر کا خیال رکھے۔ اس عورت کا نام "مرجان" تھا یہ وادی پہلگام کی (اسرائیلی) لڑکی تھی۔ حضرت مسیحؑ نے اس سے نکاح کر لیا اس کے بطن سے آپؑ کی اولاد بھی ہوئی۔ (4)

مسیحؑ کے آخری لمحات:

حضرت مسیحؑ کی آخری زندگی آرام و سکون سے گزری، سری نگر (کشمیر) کے محلہ خانیار میں آپؑ نے مستقل سکونت اختیار کر لی، یہیں آپؑ بیمار ہوئے، عمر بھی حدیث نبوی کی رو سے قریباً ایک سو بیس سال کی ہو چکی تھی۔ (5)

جب آپؑ کا آخری وقت آیا تو آپؑ کے خادمِ خاص اور محبوب حواری جنہیں بعض مورخین نے توما" اور بعض نے ابا بد (Aba Bid) کا نام دیا ہے آپؑ کے پاس موجود تھے۔ یہ وہی توما (تھوما) حواری ہیں جو سفرو حضر میں آپؑ کے ساتھ رہے تھے۔ آپؑ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا کہ میں جہاں فوت ہو جاؤں وہیں مجھے دفن کرنا۔ اس کے بعد آپؑ نے اس شاگرد کو کچھ نصائح فرمائیں آپؑ کی زندگی کے آخری چند الفاظ جو تاریخ نے ریکارڈ کر لئے یہ تھے:۔

"میں نے ان لوگوں کو اکٹھا کر دیا ہے جو بکھرے ہوئے تھے (یعنی بنی اسرائیل) اور جن کی طرف میں (نبی بنا کر) بھیجا گیا تھا۔ یہ سچے عقیدے کے لوگ ہیں۔ دنیا سے میرے رخصت ہونے کا وقت آگیا ہے اب میرے جسم اور روح کے درمیان مفارقت ہونے والی ہے۔ جو احکامات میں نے دیے ہیں ان پر عمل کرنا اور سچائی کا راستہ کبھی نہ چھوڑنا اس راستے پر خوش دلی کے ساتھ گامزن رہنا۔" اس کے بعد آپؑ نے اپنے اس شاگرد کو ہدایت فرمائی کہ میرے لئے تھوڑی سی جگہ ہموار کر دو' تب آپؑ اس جگہ پیر پھیلا کر لیٹ گئے' سر شمال کی طرف کر لیا اور چہرہ مشرق کی طرف اور چند لمحوں کے بعد اپنی جان' جان آفریں کے سپرد کر دی (6) "اناللہ و انا الیہ راجعون۔"

حضرت مسیحؑ کی وصیت کے مطابق آپؑ کو اسی جگہ سپردِ خاک کر دیا گیا جہاں آج بھی آپؑ کا مزار مبارک مرجع خلائق ہے۔ بہت سے لوگ ہر روز ننگے پیر اس پر حاضری دیتے ہیں اور اس سے برکت حاصل کرتے ہیں۔ اس مزار کو جانے والے راستے پر جو بورڈ لگا ہوا ہے اس پر "یوز آسف" نبی کا نام درج ہے عام لوگ بس اتنا ہی جانتے ہیں کہ یہ قبر یوز آسف نام کے ایک نبی کی ہے۔ جو مغرب کی طرف واقع ایک دور دراز ملک سے آکر یہاں مقیم ہوا تھا۔ یہ یوز آسف کون تھے؟ اس بارے میں انہیں اس سے زیادہ معلومات حاصل نہیں نہ یہ لوگ ان کے اصل نام سے واقف ہیں اگر انہیں کبھی اس حقیقت کا علم ہوا بھی تو جہلانے اس پر پردے ڈال کر انہیں پھر بے علم بنا دیا۔ ہونا بھی ایسا ہی

چاہئے تھا کیونکہ ہر امر کے ظہور کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے' ہر صداقت اپنے وقت پر ہی کھلتی ہے۔ اگر سارے اسرار و رموز پچھلے لوگ ہی بیان کر جاتے تو اگلوں کے لئے کیا' باقی رہتا۔ چنانچہ اب ایسی شہادتیں منظر عام پر آگئی ہیں جن سے یہ معلوم کرنا آسان ہو گیا ہے کہ یوز آسف کون تھے؟

یوز اور یسوع؟

یوز آسف دراصل وہی نبی اللہ تھے جو فلسطین میں یسوع اور مسیحؑ کے نام سے مشہور تھے جنہیں یہودیوں نے صلیب پر چڑھا کر ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی مگر جو صلیبی موت سے حیرت انگیز طور پر زندہ بچ نکلے تھے اور شام کے راستے عرب' عراق و ایران اور افغانستان سے گذرتے ہوئے پاکستان کے شہر ٹیکسلا آئے تھے۔ وہاں سے راولپنڈی ہوتے ہوئے پہلے اڑیسہ' نیپال اور تبت گئے اور وہاں سے لاہور ہوتے ہوئے کشمیر جا کر مقیم ہو گئے اور عمر طبعی گزار کر سری نگر میں فوت ہو گئے تھے۔ ان کی وصیت کے مطابق انہیں سری نگر میں اس مقام پر دفن کر دیا گیا تھا جہاں آج "یوز آسف نبی" کے نام کا بورڈ آویزاں ہے۔

یہ تو آپ پڑھ چکے ہیں کہ جب یہودیوں اور رومی حکومت کو شبہ ہو گیا کہ وہ مسیحؑ ابن مریمؑ کو صلیب پر ہلاک کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تو انہوں نے آپؑ کو تلاش کروانے کی کوشش کی تاکہ دوبارہ گرفتار کروا کر پھر صلیب پر چڑھا دیا جائے۔ حضرت مسیحؑ کے ایک بہت بڑے اور بااثر دشمن ساؤل (پولوس) کو اس مقصد کے لئے دمشق بھیجا گیا تھا جہاں ان دنوں حضرت مسیحؑ مقیم تھے اگرچہ ساؤل اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا مگر حضرت مسیحؑ کو اس حقیقت کا ایک بار پھر احساس ہو گیا کہ دشمن بدستور آپؑ کا تعاقب کر رہا ہے اور اتنی دیدہ دلیری پر اتر آیا ہے کہ ایک غیر ملک میں بھی آپؑ پر ہاتھ ڈالنے سے گریز نہیں کرتا (دمشق اس وقت رومی سلطنت میں شامل نہیں تھا) اس لئے

آپؑ نے مزید احتیاطی تدابیر اختیار کیں اور یوز آسف کے نام سے اپنا باقی طویل ترین سفر طے کیا۔ مورخین نے یوز آسف کی جو تشریح کی ہے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ نام حضرت مسیحؑ ہی کا تھا کیونکہ اس کی معنویت یہی تقاضا کرتی ہے چنانچہ "جی سزان روم" (Jesus In Rome) کے مصنفین کی تشریح کے مطابق فارسی زبان میں یوز آسف کے معنی ہیں زخموں سے صحتیاب کرنے والوں کا قائد و رہبر اور ارامی زبان میں یوز آسف کے معنی ہیں "یسوع۔ اکٹھا کرنے والا" (7)

تھوڑا سا بھی غور کیا جائے تو یہ دونوں معنی پوری طرح جناب مسیحؑ پر صادق آتے ہیں بلکہ اس زمانے میں آپؑ کے علاوہ اور کسی پر صادق آتے ہی نہیں تھے۔ یوز آسف کے پہلے معنی بیان کئے گئے ہیں "زخموں سے صحت یاب کرنے والوں کا رہنما"۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ حضرت مسیحؑ کو صلیب پر چڑھانے سے قبل کوڑے مار کر زخمی کیا گیا' پھر صلیب پر چڑھاتے وقت ہاتھوں میں میخیں ٹھونک کر زخمی کیا گیا' آخر میں صلیب سے اتارتے وقت پسلی میں نیزہ مار کر زخمی کیا گیا۔ آپؑ کے شاگردوں نے موثر علاج کے ذریعے آپؑ کو صحت یاب کیا جن کے آپؑ رہنما تھے۔ اس وقت کی معلوم تاریخ میں آپ کے سوائے اور کسی شخص کی یہ خصوصیت نہیں کہ جسے زخمی کیا گیا ہو پھر زخموں سے صحت یاب کرنے والوں کی ایک جماعت (حواریوں) نے اس کا علاج کیا ہو' اس علاج سے وہ صحت یاب ہو گیا ہو اور اس جماعت کا وہ رہنما بھی ہو' یہ خصوصیت صرف حضرت مسیحؑ ابن مریم کی تھی۔ دوسرے معنی کی رو سے یوز آسف کہتے ہیں اکٹھا کرنے والے کو اور جناب مسیحؑ کے زمانے میں آپؑ کے سوائے اور کوئی شخص نہیں تھا جس نے طویل ترین سفر کر کے روئے زمین پر منتشر بنی اسرائیل کو ایک ہاتھ پر اکٹھا کیا ہو اور تسبیح کے ان بکھرے ہوئے دانوں کو ایک لڑی میں پرو دیا ہو۔ پس فارسی اور ارامی دونوں معنی کی رو سے یوز آسف حضرت مسیحؑ ہی کا نام تھا۔

ان دو معنی کے علاوہ ایک معنی اور بھی ہیں جو بہت ہی فکر انگیز اور عقل و فہم سے

قریب ترین ہیں یعنی ایسا شخص جو رنجیدہ اور غمگین ہو' تفصیل اس کی یہ ہے کہ آسف' اسف سے بنا ہے' اسف کے معنی ہیں رنج' غم۔ اسی لفظ اسف سے افسوس بنا ہے پس آسف کے معنی ہوئے افسوس زدہ' غم زدہ' رنجیدہ۔ یوز دراصل یسوع کی تبدیل شدہ صورت ہے' جس طرح انگریزی دانوں نے یسوع کو "جی سز" (Jesus) سے تبدیل کر دیا یعنی یسوع انگریزی میں جا کر "جیسز" بن گیا اسی طرح اگر یسوع کو "یوز" بنا لیا گیا تو یہ زیادہ قابل قبول اور اپنے اصل کے زیادہ قریب ہے۔ پس یوز آسف یا یوز آصف دراصل یسوع آسف تھا خواہ یہ تبدیلی خود حضرت مسیحؑ نے کی یا اس نام کے کثرت استعمال سے رونما ہوئی۔ بہر حال اتنی بات ثابت ہو گئی کہ کشمیر کے شہر سری نگر میں یوز آسف یا یوز آصف نبی کے نام سے جس پیغمبر کی قبر ہے اس کا نام یسوع تھا' آسف کا اضافہ اس لئے ہوا کہ وہ رنجیدہ اور غم زدہ رہتا تھا۔ یعنی وہ یسوع جو غم زدہ اور دل گرفتہ ہو کر اپنے وطن سے نکلا چونکہ حضرت مسیحؑ نے اپنی قوم کے ہاتھوں بہت دکھ اٹھائے تھے اور سخت رنجیدہ ہو کر فلسطین سے نکلے تھے پھر راستے میں بھی آپ' کو بہت دکھ دیے گئے تھے پس آپؑ نے اپنے لئے یہ نام تجویز فرمایا۔ اس میں ایک مصلحت بھی تھی چنانچہ یوز آسف نام کا پس منظر بیان کرتے ہوئے بعض مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت مسیحؑ کو نصیبین نامی شہر میں جب مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تو آپؑ نے احتیاطی تدبیر کے طور پر یہ نام اختیار کیا اور اس نام سے باقی سفر طے کیا اور پھر یسوع اور یوز آسف ایک ہی شخصیت کے دو نام ہو گئے اور یہ نام (یوز آسف یا یوز) اتنی شہرت پکڑ گیا کہ ہندوستان کے مغل بادشاہ اکبر اعظم کے دربار کا مشہور دانشور شاعر فیضی آپؑ کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ۔

"اے کہ نامے تو یوز و کرستو۔" یعنی اے وہ شخص جس کے دو نام ہیں یوز اور کرستو (کرائسٹ) انگریزی ترجمے کے الفاظ یہ ہیں۔ (8)

Aiki Nami to : Yuso Kristo (You Whose Name is Yuz or christ.)

آج سے سینکڑوں سال قبل جب حضرت مسیحؑ کی حیات و وفات یا آپؑ کے صلیب

سے زندہ یا مردہ اتر آنے کا کوئی قضیہ یا تنازعہ کھڑا نہیں ہوا تھا' اکبر اعظم کے دربار کے جید عالم اور دانشور فیضی کو یہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی کہ "اے مسیحؑ ابن مریم تو دو ناموں سے مشہور اور موسوم ہوا ایک یوز آسف اور دوسرا کرسٹو (کرائسٹ)" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے عہد میں بھی حضرت مسیحؑ کا نام یوز آسف مشہور ہو چکا تھا جو یسوع کی ایک تبدیل شدہ صورت ہے۔

مغرب کے ایک فاضل محقق مسٹر فابر قیصر نے حال ہی میں یوز آسف پر گہری تحقیق کی ہے وہ بھی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یوز آسف' یسوع اور مسیحؑ ایک ہی شخصیت کے نام ہیں اس فاضل محقق نے کشمیر کے بہت بڑے مورخ اور عالم ملا نادری کی معلومات پر اپنی تحقیق کی بنیاد رکھی ہے ملا نادری کے بیان کے مطابق:

"یوز آسف دراصل یسوع تھا جو قبائل بنی اسرائیل سے تعلق رکھتا تھا اور نبی ہونے کا دعویٰ کرتا تھا بادشاہ گوبندا کے دور میں وہ کشمیر آیا۔ بادشاہ گوبندا کی سلطنت کشمیر تک وسیع تھی' اس بادشاہ کے دور حکومت میں بہت سے مندر تعمیر کئے گئے اور بہت سے مندروں کی مرمت کی گئی۔ اس کی حدود سلطنت (کشمیر) میں ایک پہاڑی پر تخت سلیمان نامی ایک عمارت واقع تھی جو شکستہ ہو گئی تھی بادشاہ گوبندا نے اس کی مرمت کے لئے ایران سے ایک (اسرائیلی انجینئر) بلوایا جس کا نام بھی سلیمان تھا اس پر بادشاہ کی ہندو رعایا نے اعتراض کیا کہ سلیمان ہندو نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق کسی اور مذہب سے ہے اس لئے اس سے عمارت کی مرمت نہ کروائی جائے" آگے چل کر ملا نادری لکھتے ہیں کہ اس دوران دور کے ملک (فلسطین) سے ایک شخص یوز آسف کشمیر آئے اور یہاں اپنی نبوت کی تبلیغ کرنے لگے وہ بہت پاکباز اور خدا رسیدہ انسان تھے رات دن خدا کی عبادت میں گذارتے تھے اور بندگان خدا کو خداوند کریم کے احکام کی پیروی کرنے کی تعلیم دیتے تھے ان کی تعلیم کے نتیجے میں بہت سے لوگ ان کے پیروکار بن گئے اس دوران سلیمان نامی (ایرانی انجینئر) نے تخت سلیمان کی مرمت کی اور اس پر مندرجہ ذیل عبارت کندہ کروا دی

"ان ستونوں کے معمار بہشتی زرگر اور خواجہ رکن ابن مرجان ہیں۔ سال تعمیر ۵۴۔
یوز آسف نے نبوت کا دعویٰ کیا ۵۴ میں جو یسوع ہے اور اسرائیلی قبائل سے تعلق رکھتا ہے (9)

یہ عبارت بادشاہ جہانگیر کے عہد حکومت تک عمارت پر درج تھی اور مورخ کشمیر خواجہ حیدر ملک نے خود پڑھ کر یہ عبارت اپنی کتاب میں درج کی تھی۔ (10)

آگے بڑھنے سے قبل ایک بار پھر ہمیں ملا نادری کی شہادت پیش کرنی ہوگی ملا نادری کشمیر کے بہت فاضل مورخ تھے۔ ان کا لقب "ملا" اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ایک دین دار اور صاحب کردار عالم تھے کیونکہ اس زمانے میں "ملا" انتہائی محترم لقب تھا جو شاذ ہی کسی کو ملتا تھا۔ کشمیر میں آج تک "ملا" نام کی ایک قوم آباد ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قوم کے مورث اعلیٰ کو یہ خطاب دیا گیا ہو گا جو اس نے عزت کے طور پر اپنی قومیت میں تبدیل کر لیا" ملا نادری نے اپنی مشہور و معروف کتاب "تاریخ کشمیر" ۱۴۱۳ء میں لکھی تھی یہ کشمیر کی اولین فارسی تاریخ ہے۔ ملا نادری لکھتے ہیں کہ:۔

"میں نے ہندوؤں کی ایک کتاب میں (بھی) پڑھا ہے کہ یہ نبی (یوز آسف) دراصل حضرت عیسیٰ روح اللہ تھے جنھوں نے یوز آسف کا نام اختیار کیا تھا۔ اصل حقیقت تو خدا تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ انہوں (حضرت عیسیٰ) نے بقیہ ساری زندگی وادی ہی میں گزار دی" (یعنی یہیں فوت ہوئے) (11)

گویا ہندو' مسلمان اور عیسائی تینوں مذاہب کے جدید و قدیم مورخ اس امر پر متفق ہیں کہ یوز آسف ہی یسوع (مسیحؑ) تھے جو دور دراز ملک سے کشمیر آئے تھے اور بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔

راجہ شالواہن اور گوپادتہ؟

یہاں پہنچ کر تاریخ کا ایک زیرک طالب علم بجا طور پر سوچے گا کہ ایک طرف تو حضرت مسیحؑ کی ملاقات راجہ شالواہن یا شالباہن سے ہوتی ہے جو کشمیر کا راجہ تھا دوسری

طرف راجہ گوپادتہ کو کشمیر کا راجہ بتایا جاتا ہے اور وہ بھی حضرت مسیحؑ کے دور ہی میں برسر اقتدار تھا گویا دونوں حکمرانوں کا ایک ہی دور حکومت تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک علاقے پر بیک وقت دو بادشاہوں کی حکومت ہو۔

اس سلسلے میں دو بنیادی باتیں ذہن میں رکھنی چاہئیں۔ پہلی بات یہ کہ شالواہن یا شالباہن نام کا کوئی ایک راجہ نہیں گزرا اس نام کے بہت سے راجاؤں کا تاریخ میں نام آتا ہے۔ دراصل یہ ایک شاہی خاندان کا لقب تھا اور اس خاندان کا تعلق یوچی قبیلے سے تھا جو وسط ایشیا سے ہندوستان میں داخل ہوا تھا۔ یہ خاندان "شالواہن" کا لقب اسی طرح استعمال کرتا تھا جس طرح خاندان اموی، خاندان عباسی، خاندان فاطمی، خاندان سور اور خاندان مغلیہ۔ شالواہن خاندان نے قریباً ساڑھے چار سو سال ہندوستان پر حکومت کی اور برصغیر پر کسی خاندان کا یہ طویل ترین دور حکومت تھا۔ اس خاندان کا سب سے طاقتور حکمران "Gautami Putra Stakarni" تھا۔ (11-A)

"یہ گوتمی پترا" شالواہن کے نام سے پہلی صدی عیسوی کے آخر میں شمال مغربی ہند پر حکمراں تھا چنانچہ قدیم ہندوستان کی تاریخ "Ancient India" کے مصنف پروفیسر ریپسن (Rapson) نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ راجہ شالواہن نے "ساکا" قوم کو کشمیر سے نکال دیا۔ (محروم اقتدار کر دیا) اور کشمیر فتح کرنے کے بعد ۷۸ء کے قریب دکن (جنوبی ہند) کی طرف روانہ ہوا وہاں بھی ساکا قوم کے ایک بادشاہ کی حکومت تھی۔ شالواہن نے دکن میں بھی ساکا حکمراں کو شکست دی اور اپنی فتح کی خوشی میں اپنے نام سے ایک نیا سمت (سنہ) جاری کیا جو تاریخ میں شالواہن سمت کہلاتا ہے، مسٹر جے ٹی وہیلر نے اپنی تاریخ ہند میں تصریح کی ہے کہ راجہ شالواہن نے اپنی فتح کی خوشی میں جو سنہ جاری کیا وہ یکم بیساکھ کلجگ ۳۱۷۹ کو شروع ہوا۔ اس حساب سے یہ تاریخ ۱۴ مارچ ۷۸ء بنتی ہے۔

(11-B)

عجیب بات ہے کہ یہی زمانہ تھا جب حضرت مسیحؑ کشمیر میں موجود تھے اور اسی زمانے میں آپؑ کی راجہ شالواہن سے ملاقات ہوئی جس کی روداد سنسکرت کی شہرہ آفاق کتاب "بھوشیا مہا پران" میں بیان کی گئی ہے۔ ان دنوں راجہ شالواہن بغرض سیاحت کشمیر گیا ہوا تھا۔

دوسری بات یہ کہ راجہ شالواہن صرف کشمیر کا راجہ نہیں تھا وہ بہت بڑا فرماں روا تھا جس کی حدود سلطنت شمال سے جنوب تک پھیلی ہوئی تھیں کشمیر تو اس کی عظیم مملکت کا ایک صوبہ تھا۔ یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ کشمیر کی قدیم تاریخوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے پر مدت دراز تک باہر سے راجے مقرر ہوا کرتے تھے جو اگرچہ کشمیر کے حکمراں ہوتے تھے مگر ہندوستان کے کسی نہ کسی بادشاہ کے تابع اور باج گزار ہوتے تھے چنانچہ ہندوستان کے مشہور ہندو مورخ پنڈت کلیان نے اپنی شہرہ آفاق سنسکرت کتاب "راج ترنگنی" میں راجہ بکماجیت کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک روز اس نے کہا کہ کشمیر کی خوشنما سرزمین پر آج کل کوئی حکمراں نہیں پس میں وہ ملک اس لائق شخص (ماترگپت) کو دیتا ہوں" (11-C)

گویا ثابت ہو گیا کہ کشمیر کی حیثیت مرکزی حکومت کے ایک صوبے کی تھی جس پر دہلی، اجین، مگدھ (بہار) اور گندھارا کے حکمراں کسی شخص کو بطور راجہ نامزد کر دیتے تھے اور اس راجہ کے خاندان کی کئی کئی پشتیں ریاست پر حکومت کرتی رہتی تھیں۔ ایسے ہی خاندانوں میں ایک خاندان گوپادتہ تھا چنانچہ کشمیر کی قدیم تاریخ میں گوپادتہ کے نام سے بہت سے راجہ گزرے ہیں۔ دراصل گوپادتہ بھی شالواہن کی طرح ایک لقب تھا۔ ان میں سے ایک گوپادتہ وہ تھا جس کا اصل نام گوپانند تھا اور جو گوپادتہ کا لقب اختیار کر کے کشمیر میں برسراقتدار آیا۔ گویا ثابت ہو گیا کہ گوپادتہ شخصی نام نہیں بلکہ لقب تھا ورنہ راجہ "گوپانند یہ لقب کبھی اختیار نہ کرتا" یہ گوپانند وہی "گوپادتہ" ہے جس نے ریاست

میں بہت سی عمارتیں، سڑکیں اور پل تعمیر کروائے اور سلیمان نامی ایک ایرانی انجنیئر سے "تخت سلیمان" کی مرمت کروائی۔ اسی گوپادتہ کا تذکرہ ملا نادری نے اپنی تاریخ کشمیر میں کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کے دور میں یوز آسف (حضرت مسیحؑ) کشمیر میں آئے اور اہل کشمیر میں اپنی نبوت کا اعلان کیا۔

ایک داخلی شہادت

اب ہم اس موضوع پر ایک داخلی شہادت پیش کرتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ اور یوز آسف ایک ہی شخصیت کے نام ہیں۔ حضرت مسیحؑ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپؑ تمثیلوں میں کلام کیا کرتے تھے یعنی حکایتوں کی صورت میں۔ آپؑ کے بارے میں تورات کا بیان بھی یہی ہے کہ آنے والا مسیحؑ تمثیلوں میں کلام کیا کرے گا چنانچہ انجیل ان تمثیلوں سے بھری پڑی ہے ان میں سے ایک تمثیل یوں ہے کہ:۔

"دیکھو ایک بونے والا بیج بونے نکلا اور بوتے وقت کچھ دانے راہ کے کنارے گرے اور پرندوں نے آ کر انہیں چگ لیا ○ اور کچھ پتھریلی زمین پر گرے جہاں ان کو بہت مٹی نہ ملی اور گہری مٹی نہ ملنے کے سبب سے جلد اگ آئے ○ اور جب سورج نکلا تو جل گئے اور جڑ نہ ہونے کے سبب سے سوکھ گئے ○ اور کچھ جھاڑیوں میں گرے اور جھاڑیوں نے بڑھ کر انہیں دبا لیا ○ اور کچھ اچھی زمین میں گرے اور پھل لائے۔" (12)

کیا یہ تعجب انگیز امر نہیں کہ یہی حکایت حضرت یوز آسف بیان کرتے ہیں چنانچہ قرون اولیٰ کی مشہور کتاب "صحیفہ بود آصف" میں یہ حکایت اس طرح بیان کی گئی ہے:۔

"جب ایک کسان اپنے کھیت میں بیج بونے کے لئے جاتا ہے تو بعض بیج ایک طرف گر جاتے ہیں جنہیں پرندے کھا جاتے ہیں۔ بعض بنجر زمین پر گر جاتے ہیں اور بعض پتھریلی زمین پر گر جاتے ہیں اور پژمردہ ہو جاتے ہیں بعض بیج کانٹوں پر گر جاتے ہیں اور بیکار ہو جاتے ہیں لیکن جو بیج زرخیز زمین میں گرتے ہیں وہ بڑھتے اور پھل پھول پیدا کرتے

ہیں (12-A)

کیا یہ دونوں حکایتیں ایک ہی شخص بیان نہیں کر رہا؟ اور آگے چلئے، حضرت مسیحؑ اپنی اس تمثیل کی تشریح کرتے ہیں، تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"پس بونے والے کی تمثیل سنو ○ جب کوئی بادشاہ کا کلام سنتا ہے اور اسے فی الفور خوشی سے قبول کر لیتا ہے لیکن اپنے اندر جڑ نہیں رکھتا بلکہ چند روزہ ہے اور جب کلام کے سبب سے مصیبت یا ظلم برپا ہوتا ہے تو فی الفور ٹھوکر کھاتا ہے ○ اور جو جھاڑیوں میں بویا یہ وہ ہے جو کلام کو سنتا ہے اور دنیا کی فکر اور دولت کا فریب اس کلام کو دبا دیتا ہے اور وہ بے پھل رہ جاتا ہے ○ اور جو اچھی زمین میں بویا گیا یہ وہ ہے جو کلام کو سنتا اور سمجھتا ہے اور پھل بھی لاتا ہے۔ (12-B)

حضرت مسیحؑ کی طرح یوز آسف بھی ہمیں اپنی تمثیل کی تشریح کرتے نظر آتے ہیں اور وہ اس طرح:۔

"کسان سے میری مراد عقلمندی کی ہے۔ بیج سے مراد عقلمندی کے الفاظ ہیں۔ جو بیج پرندے کھا جاتے ہیں اس سے میری مراد نا سمجھ لوگ ہیں اور جو بیج پتھریلی زمین پر پھینکے گئے ان سے میری مراد وہ لوگ ہیں جو عقلمندی کی باتوں کو سمجھتے نہیں اور جو بیج کانٹوں پر پھینکے گئے ان سے میری مراد وہ لوگ ہیں جو بات کو سمجھتے تو ہیں لیکن اس پر عمل نہیں کرتے اور جو بیج بڑھتے اور پھل پھول پیدا کرتے ہیں ان سے میری مراد وہ لوگ ہیں جو ایمان لے آتے ہیں اور سچائی کی پیروی کرتے ہیں۔ (12-C)

یہ تمثیل اور اس کے دونوں حصوں کو غور سے پڑھئے اور دیکھئے کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ یہ تمثیل ایک ہی شخص نے بیان کی ہے الفاظ کا تھوڑا سا فرق ہے یہ فرق بھی اس وجہ سے ہے کہ راویوں نے ان تمثیلوں کو اپنے اپنے رنگ میں بیان کیا ہے اور ایک نے دوسرے سے نقل کرتے ہوئے کچھ کمی یا کچھ تغیر کر دیا ورنہ مفہوم بھی ایک ہے اور، انداز بیان بھی قریب قریب ایک ہے اور طرز تشریح بھی ایک ہے پس اس تقابل سے بھی

ثابت ہو گیا کہ یوز آسف اور یسوع دراصل ایک ہی شخص کے نام ہیں جو یسوع اور یوز آسف دونوں ناموں سے مشہور ہوئے۔

قبر مسیحؑ

اب ہم اس قبر کے بارے میں چند حقائق پیش کرتے ہیں جو سری نگر (کشمیر) کے محلّہ خانیار میں گزشتہ انیس سو سال سے مرجع خلائق ہے اور جو عام طور پر یوز آسف نبی کی قبر کہلاتی ہے قبر یہودیوں کے مزارات اور قبروں کی طرز تعمیر کے مطابق بنائی گئی ہے اس میں ایک زمین دوز کمرہ بھی ہے جس میں ایک چھوٹی سی کھڑکی رکھی گئی ہے یعنی قبر کمرے میں ہے قبر کا رخ مسلمانوں کی قبروں سے بالکل مختلف "شرقاً" "غرباً" ہے جو یہودیوں کا طریقہ تھا۔ اس کے قبر مسیحؑ ہونے کی ایک زبردست اور ناقابل شکست دلیل چند سال قبل منظر عام پر آئی ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مزار پر پتھر کی جو سلیں لگی ہوئی ہیں ان میں سے ایک سل پر زمانہ قدیم سے رات کو موم بتی روشن کر دی جاتی تھی اس طرح موم پگھل پگھل کر اس پر جمتا چلا گیا۔ چند سال قبل جب اس قبر کے بارے میں تحقیق کی جا رہی تھی تو موم کی تہوں کو کھرچ کھرچ کر ہٹایا گیا۔ جب پتھر صاف ہو گیا تو لوگوں نے دیکھا کہ اس پر حضرت مسیحؑ کے قدموں کے نشانات کندہ تھے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ نشان کندہ کروانے والوں نے پیروں پر زخموں کے نشان بھی کندہ کروا دیئے تھے۔ یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ زمانہ قدیم میں بھی کشمیر کے لوگوں کو یہ بات معلوم تھی کہ اس قبر میں جو شخصیت محو خواب ہے اسے صلیب دی گئی تھی ورنہ اس کے پیروں پر زخموں کے نشان کیوں بنائے گئے تھے۔ اس قبر کے علاوہ روئے زمین پر ایسی کوئی قبر موجود نہیں جس کی سلوں پر زخمی پیروں کے نشانات کندہ کئے گئے ہوں۔

ایک تاریخی شہادت

دوسری شہادت پتھر کی سلوں پر کندہ وہ عبارت ہے جو بہ آسانی پڑھی جا سکتی ہے۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو حضرت مسیحؑ نے واقعہ صلیب کے بعد ایک موقع پر اپنے شاگردوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہے تھے جنہیں قبر پر کندہ کیا گیا ہے۔ الفاظ یہ تھے (ترجمہ) "دیکھو وہ عورت کون تھی؟ میں تمہارے گھر میں داخل ہوا لیکن تم نے میرے پاؤں کو صاف کرنے کے لئے پانی نہ دیا لیکن اس عورت نے اپنے آنسوؤں سے میرے پاؤں دھوئے، انہیں اپنے سر کے بالوں سے صاف کیا میرے سر پر تم نے مرہم نہیں لگایا لیکن اس عورت نے میرے پیروں پر مرہم لگایا وہ کہاں سے آئی ہے؟ اس کے گناہ اگرچہ بہت زیادہ ہیں لیکن معاف کر دیے گئے ہیں کیونکہ اس نے بہت محبت کی ہے۔ (13)

اس عبارت پر تھوڑا سا غور کیجئے حضرت مسیحؑ واقعہ صلیب کے بعد اپنے شاگردوں سے ملتے ہیں، جس گھر میں آپؑ مقیم ہیں وہاں ایک گنہگار عورت بھی آتی ہے وہ آپؑ کی خدمت کرنے میں دوسروں پر سبقت لے جاتی ہے اپنے شاگردوں کو مخاطب کر کے آپؑ فرماتے ہیں کہ قبل اس سے کہ تم میرے پاؤں صاف کرتے اس عورت نے بہت دل سوزی سے میرے پاؤں صاف کیے جنہیں تمثیلی زبان میں آپؑ آنسوؤں اور سر کے بالوں سے صاف کرنا کہتے ہیں پھر فرماتے ہیں کہ قبل اس سے کہ تم میرے سر پر مرہم لگاتے اس عورت نے میرے پاؤں پر (بھی) مرہم لگایا۔ حضرت مسیحؑ کے یہ الفاظ ثابت کرتے ہیں کہ آپؑ کے زخم لگے تھے اگر زخم نہیں تھے تو مرہم لگانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ زخم اس وقت آئے تھے جب صلیب پر چڑھاتے وقت آپؑ کو کانٹوں دار تاج پہنایا گیا تھا چنانچہ انجیل میں ہے کہ:۔

"اور سپاہیوں نے کانٹوں کا تاج بنا کر اس کے سر پر رکھا۔" (14)

حضرت مسیحؑ کے پیر بھی واقعہ صلیب سے متاثر ہوئے تھے، وہ اس طرح کہ رومی سپاہیوں نے آپؑ کے دونوں پاؤں دوہرے کر کے رانوں کے ساتھ ملا کر صلیب سے باندھ دیئے تھے۔ چنانچہ واقعہ صلیب کا ایک عینی شاہد لکھتا ہے کہ:۔

"یسوع کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں کے پاس سے دوہری کر کے پیچھے کی طرف باندھ دی گئیں (15)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ آپؑ کی ٹانگیں دوہری کر کے صلیب کی لکڑی کے ساتھ کس کر باندھ دی گئی تھیں اور پھر گھٹنوں بندھی رہیں اس لئے ٹانگوں پر ورم پیدا ہو گیا تھا حضرت مسیحؑ اسی ورم کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں کہ اس عورت نے میرے پاؤں پر بھی مرہم لگایا۔

اس سارے واقعے کی تصویر اس طرح ابھرتی ہے کہ حضرت مسیحؑ کے سر پر زخم اور ٹانگوں پر ورم آیا۔ ایک عورت نے ان زخموں کو صاف کیا اور ان پر مرہم لگایا دوسری طرف جس شخص کو سری نگر (کشمیر) کے اس مزار میں دفن کیا گیا تھا اس کے بھی زخم آئے تھے اس کے مزار پر پتھر کی سل لگا کر نشاندہی کر دی گئی تھی کہ اس قبر میں وہ شخصیت مدفون ہے جس کے جسم پر زخم لگے تھے۔ کیا حضرت مسیحؑ کے علاوہ دنیا میں کوئی اور شخصیت ایسی گزری ہے جو بنی اسرائیل سے تعلق رکھتی ہو؟ جسے صلیب پر چڑھایا گیا؟ پھر صلیب سے زندہ اتر آئی ہو؟ اس کے زخم آئے ہوں؟ اس واقعے کے بعد اس نے طویل سفر کیا ہو؟ اور وہ خدا کا نبی بھی ہو؟ کوئی ایسی شخصیت ہے تو ہمیں اس کا پتہ بتایا جائے اس کی نشاندہی کی جائے۔ یقیناً حضرت مسیحؑ کے علاوہ ایسی کوئی شخصیت آج تک پیدا نہیں ہوئی اور واقعات کے ثابت کر دیا کہ وہ شخصیت سری نگر (کشمیر) میں واقع اسی قبر میں ابدی نیند سو رہی ہے۔

دونوں قبروں میں مشابہت

پھر اس موجودہ قبر اور اس قبر میں بھی کئی مشابہتیں ہیں جس میں صلیب سے اتارنے کے بعد حضرت مسیحؑ کو عارضی طور پر رکھا گیا تھا۔ انجیل شہادت دیتی ہے کہ جناب مسیحؑ کے شاگرد یوسف ارمتیہ نے ایک چٹان کھود کر یہ قبر تعمیر کروائی تھی یہ قبر کمرہ نما تھی اور اس میں اتنی گنجائش تھی کہ بیک وقت کئی آدمی بیٹھ سکتے تھے چنانچہ انجیل کہتی ہے کہ "سبت" گزرنے کے بعد جب حضرت مسیحؑ کی عقیدت مند خواتین آپؑ کی قبر پر گئیں تو انہوں نے دیکھا کہ قبر کے منہ پر جو پتھر رکھ دیا گیا تھا وہ لڑھکا ہوا ایک طرف کو پڑا ہے اور مسیحؑ قبر میں نہیں ہیں بلکہ ایک اور شخص بیٹھا ہے۔ انجیل کے الفاظ یہ ہیں:

"جب سبت کا دن گزر گیا تو مریم مگدلینی اور یعقوب کی ماں مریم اور سلومی نے خوشبودار چیزیں مول لیں تاکہ آ کر اس پر ملیں ـــــ جب انہوں نے نگاہ کی تو دیکھا کہ پتھر لڑھکا ہوا ہے کیونکہ وہ بہت ہی بڑا تھا اور قبر کے اندر جا کر انہوں نے ایک جوان کو سفید جامہ پہنے ہوئے داہنی طرف بیٹھے دیکھا۔" (16)

انجیل کے الفاظ صاف طور پر پر صراحت کر رہے ہیں کہ یہ قبر کمرہ نما تھی اور اس میں اتنی گنجائش تھی کہ میت کے علاوہ کم از کم چار آدمی بیک وقت بیٹھ سکتے تھے چنانچہ انجیل بیان کر رہی ہے کہ اس قبر میں "تین عورتیں داخل ہوئی تھیں ایک مریم مگدلینی دوسری وہ مریم جسے یعقوب کی ماں کہا گیا ہے اور تیسری عورت جس کا نام سلومی تھا۔ ان تین عورتوں نے قبر میں داخل ہو کر ایک اور شخص کو بیٹھا ہوا پایا جس نے سفید لباس زیب تن کیا ہوا تھا اس سے ثابت ہو گیا کہ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں میت کے علاوہ کم از کم چار آدمی بیک وقت بیٹھ سکتے تھے اور شاید کھڑے بھی ہو سکتے ہوں' دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ سری نگر (کشمیر) میں جو قبر یوز آسف سے منسوب کی جاتی ہے وہ بھی کمرہ نما ہے چنانچہ اس کے بارے میں یہ صراحت ریکارڈ پر آ گئی ہے کہ اس عمارت میں ایک زمین دوز کمرہ ہے جہاں ایک چھوٹی سی کھڑکی رکھی گئی ہے یہ مزار مسلمانوں کی قبروں اور مزارات سے بالکل مختلف طرز کا ہے یعنی قبر کا رخ شرقاً "غرباً" ہے۔

چنانچہ مورخ انڈریس فیبر قیصر نے اس مزار کے بارے میں اپنے چشم دید تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔

"دونوں قبروں کا رخ شمالاً" جنوباً" ہے جیسا کہ مسلمانوں کا دستور تھا لیکن حضرت مسیحؑ کی اصل قبر تو نیچے تہہ خانے (کمرہ) میں ہے اس کا رخ وہی ہے جو یہودیوں کا دستور تھا یعنی شرقاً" غرباً" جانب مغرب زمین دوز کمرے تک جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں لیکن اب یہ راستہ بند ہو چکا ہے البتہ ایک دریچہ باقی رہ گیا ہے۔" (17)

غور کرنا چاہئے کہ دونوں قبروں میں یہ مشابہت کیسے پیدا ہو گئی یعنی حضرت مسیحؑ کی پہلی اور عارضی قبر بھی کمرہ نما تھی اور یہ دوسری اور آخری قبر بھی کمرے میں ہے پہلی اور عارضی قبر میں بھی ہوا کے لئے تھوڑی سی جگہ رکھی گئی تھی اور اس دوسری اور آخری قبر میں بھی ایک دریچہ ابھی تک باقی ہے کیا اس سے ثابت نہیں ہو جاتا کہ اس سارے معاملے میں تصرف الٰہی کار فرما ہے اور اللہ تعالیٰ بتانا چاہتا تھا کہ اس قبر میں بھی وہی مسیحؑ ابن مریم محو خواب ہے جو اس سے قبل اسی طرز کی قبر میں تین روز رہا تھا۔

اب آخر میں اس قبر کے بارے میں دو اہم اور موقر شہادتیں پیش کر کے ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ یہ دونوں شہادتیں دو فاضل مسیحیوں کی ہیں، ان میں سے ایک بیروت کے مسیحی جریدے "الہلال" کے ایڈیٹر ہیں، ان کی تحریر کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"سری نگر کے محلہ خانیار میں ایک مقبرہ ہے، کشمیر کے لوگ اسے ایک نبی یوز آسف کا مقبرہ بتاتے ہیں۔ وہاں کے لوگ اس مقبرے کی زیارت کرنے اور نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لئے باقاعدگی سے اس پر حاضر ہوتے ہیں۔ تاریخ کی بعض کتابوں میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ یوز آسف ایک نبی تھے جو ایک دور دراز ملک سے آئے تھے اور وہیں (سری نگر میں) فوت ہوئے اور اس شہر میں دفن کئے گئے" (18)

کیا یہ یوز آسف کسی اور نام سے بھی موسوم ہیں؟ اور کشمیر کے لوگ اس قبر کے بارے میں کوئی اور رائے بھی رکھتے ہیں؟ مغرب کے ایک مسیحی سیاح اور فوجی افسر کے سفرنامے سے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے۔ یہ سیاح کیپٹن سی ایم ازک (CAPT:C.M.ENRIQUE) ہیں۔ سیاح موصوف لکھتے ہیں کہ:۔

سری نگر میں قیام کے دوران اس شہر میں واقع مقبروں کے
بارے میں بعض حیرتناک روایتیں میرے علم میں آئیں ان
میں سے ایک مقبرے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں
یسوع دفن ہیں۔" (19)

یہ روایت اس مصنف کی ہے جو مذہبا" اس عقیدے کا قائل ہے کہ جناب مسیحؑ آسمان پر اٹھالئے گئے اور اللہ تعالیٰ کی دائیں طرف تشریف فرما ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ سری نگر میں ایک ایسی قبر بھی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں یسوع (حضرت مسیحؑ) دفن ہیں۔ اس روائیت کو وہ عجیب اور حیرت ناک بھی قرار دیتا ہے۔ آگے چل کر یہی مصنف اپنے قارئین کو ایک اور خبر دیتا ہے کہ:۔

" یہاں ایک چھڑی ہے جسے "یسوع کی چھڑی کہتے ہیں یہ
متبرک چھڑی شاہ ہمدانؒ کے مقبرے میں محفوظ ہے کسی وبا یا
مصیبت کے وقت اسے باہر نکالا جاتا ہے" (ملخص) (20)

ظاہر ہے کہ یسوع (حضرت مسیحؑ) کشمیر آئے ہوں گے تب ہی ان کی چھڑی بھی ان کے ساتھ آئی جو آج تک شاہ ہمدانؒ کے مزار مبارک کے احاطے میں بطور مقدس یادگار محفوظ ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اس چھڑی کو حضرت شاہ ہمدانؒ سے منسوب نہیں کیا گیا حالانکہ وہ محفوظ ان کے مزار میں ہے اس لئے یہ انہی سے منسوب ہونی چاہئے تھی۔ مگر منسوب حضرت مسیحؑ سے ہوئی کیونکہ اصلا" یہ انہی کی چھڑی تھی۔

اس سلسلے کا ایک اور قابل ذکر بیان ممتاز برطانوی سفارت کار سر فرانسز ینگ ہزبنڈ (SIR FRANCIS YOUNG HUSBAND) کا ہے جو کشمیر میں برطانوی ریذیڈنٹ کی حیثیت سے مدتوں مقیم رہے۔ مسٹر ہزبنڈ نے کشمیر اور اہل کشمیر کی ایک مبسوط تاریخ بھی لکھی تھی۔ موصوف یوز آسف کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"انیس سو سال قبل کشمیر میں ایک بزرگ مقیم ہوئے تھے جن کا نام یوز آسف تھا ان کا انداز تبلیغ اس لحاظ سے ممتاز تھا کہ وہ مثالیں دے کر نصائح فرماتے تھے اور یہ مثالیں وہی ہیں جو حضرت مسیحؑ ناصری کی تعلیمات میں پائی جاتی ہیں جیسے سچ بولنے والے کی کہانی۔ ان کا مقبرہ سری نگر میں ہے اور عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یوز آسف اور یسوع ایک ہی شخصیت کے نام ہیں خصوصا" اس نظریئے کو اس وقت اور زیادہ تقویت حاصل

ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں کے لوگ اپنی شکل و صورت کے لحاظ سے بالکل بنی اسرائیل کے افراد معلوم ہوتے ہیں۔ (21)

پس یہ قرائن اور شہادتیں اس خیال اور نظریئے کی تائید کرتی بلکہ یقین میں تبدیل کر دیتی ہیں کہ حضرت مسیحؑ کشمیر میں آئے تھے، سری نگر میں قیام فرمایا تھا، وہیں وفات پائی اور وہیں آپؑ کو دفن کیا گیا۔

حوالہ جات

(1) A.D.V. Hear II XX II-4 Documents of Christian Chourch of Bettenson P-30

(2) History of Dogma By Dr. Adolf Harnack PP. 277-278

(3) The Crucifixion By An Eye Witness P-53

(3-A) "Times" London 8 March 1963.

(4) "Nigaristan-e-Kashmir" Noted From Jesus Died in Kashmir" by Andres Faber Kaiser P.90.

(5) زرقانی جلد پنجم - صفحہ نمبر421 و مواہب اللدنیہ از قسطلانی جلد اول صفحہ نمبر42

(6) The Wisdom of Balahar - Aghristian Legend of the Buddaha, By David Marshal Long (New York) p-37.

(7) Jesus in Rome p-81

(8) Jesus Died in Kashmir By A.Faber Kaiser (English Edition) P-80

(9) تاریخ کشمیر صفحہ نمبر35 مولفہ ملا نادری بحوالہ Jesus Died in Kashmir P-86-87

(10) "Jesus Died in Kashmir" P-87

(11) "Jesus in Rome" and "After The Crucifixion" (Chapter, of Jesus Lived in India) P-199

(11-A.) Encyclopedia Americana Vl: 14 P-941 (Ed:1981)

(11-B) History of India By H. Talboys Wheeler Vol-1, P-23 London : Trubner And Co., Ludgate Hill

(11-C) "راج ترنگنی" جلد اول صفحہ نمبر222-221 اردو ترجمہ ٹھاکر اچھر چند شائع کردہ لائٹ اینڈ لائف پبلیشرز نئی دلی 1979

(12) متی باب نمبر13 آیت نمبر3 تا نمبر8

(12-A) کمال الدین مولفہ شیخ السعید الصادق صفحہ نمبر327

(12-B) متی باب نمبر13 آیت نمبر18 تا آیت نمبر23

(12-C) کمال الدین مولفہ شیخ السعید الصادق صفحہ نمبر327

(13) انجیل میں حضرت مسیحؑ کے یہ الفاظ درج ہیں مگر کسی قدر کمی و بیشی کے ساتھ ملاحظہ ہو لوقا باب نمبر7 آیت نمبر26 تا نمبر50

(14) یوحنا باب نمبر19 آیت نمبر1

(15) The Crucifixion By An Eye Witness P-60

(16) مرقس باب نمبر16 آیت نمبر1 تا نمبر5

(17) Jesus Died in Kashmir P-100

(18) "الہلال" جلد نمبر دوم حصہ چہارم 1903ء (بیروت)

(19) The Realms of The Gods: P - 97 By Captain C.M. Enrique,

(20) The Realms of The Gods, P-101

(21) "Kashmir, "By Sir Francis Young Husband, P-112

مسیحؑ خُدا کی پناہ میں

اس کی گفتگو سن کر بادشاہ نے یہاں کے گمراہ مذہبی رہنما کو
برطرف کر دیا اور بے دینوں کے اس بے رحم ملک میں اس
بزرگ کو نیا رہنما مقرر کر دیا ---- یہ سرزمین کشمیر تھی اور یہ
بزرگ رہنما جناب مسیحؑ تھے۔

کتاب ختم کرنے سے قبل ایک اہم تاریخی دستاویز کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ یہ انگریزی زبان کی ایک کتاب ہے جس کا نام "جی سز ان روم" (Jesus in Rome) ہے۔ یہ کتاب دو مصنفوں "رابرٹ گریوز" اور "جوشوا پوڈرو" نے مل کر لکھی ہے۔ دونوں مذہبا" مسیحی اور بہت فاضل لوگ ہیں اس لئے کتاب بہت محققانہ ہے۔ کتاب کا پانچواں باب بہت فکر انگیز اور تحقیقی ہے جو ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے:

"سچی بات یہ ہے کہ (بعض) مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہمیں سخت ناگوار گزرتا ہے کہ یسوع فوت ہو گئے اور کشمیر میں دفن ہیں۔" (۱)

اس کے باوجود فاضل مصنفوں نے نہایت دیانت داری سے وہ تمام شہادتیں اپنی کتاب میں درج کر دیں جو ان کے مذہبی عقیدے کے خلاف ہیں اور جن سے ثابت ہوتا ہے کہ:

(۱) یوز آسف اور یسوع (مسیح) ایک ہی شخصیت کے نام ہیں۔

(۲) حضرت مسیحؑ کشمیر تشریف لائے، یہیں آپؑ کی وفات ہوئی اور یہیں آپؑ

کو دفن کیا گیا۔

(۳) کشمیر کا حاکم حضرت مسیحؑ سے اس حد تک متاثر تھا کہ اس نے آپؑ کو وہاں کا مذہبی سربراہ مقرر کر دیا۔

ذیل میں ہم ان فاضل مصنفوں کی کتاب کے بعض اقتباسات کا اردو ترجمہ درج کرتے ہیں اس کے ساتھ ہمارا تبصرہ اور محاکمہ بھی شامل ہے۔ ان اقتباسات میں جو الفاظ قوسین کے درمیان درج کئے گئے ہیں وہ ہمارے ہیں اور بطور وضاحت شامل کئے گئے ہیں۔ مصنف لکھتے ہیں:۔

"سچی بات یہ ہے کہ (بعض) مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہمیں سخت ناگوار گزرتا ہے کہ "یسوعؑ فوت ہو گئے اور کشمیر میں دفن ہیں" لیکن ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ اس کتاب کی بنیادی اور اہم دلیل سے قطع نظر کر لیں جو یہ ہے کہ بادشاہ کلاؤ ڈیوس (Claudius) کے دور حکومت میں (واقعہ صلیب کے بعد) حضرت مسیحؑ روم تشریف لے گئے تھے۔ اگرچہ (عام) اسلامی روایات اسے مشکوک ٹھہراتی ہیں لیکن (جو لوگ حضرت مسیحؑ کی وفات کا نظریہ پیش کرتے ہیں ان کے) اس دعوے کی تصدیق بعض سنسکرت دستاویزات سے بھی ہوتی ہے جو دوسری صدی عیسوی میں تحریر کی گئی تھیں۔ اس سلسلہ میں اس دستاویز کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے جو بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں حکومت برطانیہ کی طرف سے کشمیر میں متعین ریذیڈنٹ سر فرانسز ینگ ہزبنڈ (Sir Francis young Husbannd) نے سپرد قلم کی تھی وہ لکھتے ہیں:

"انیس سو برس گزرے جب کشمیر میں ایک بزرگ شخص رہتا تھا جس کا نام یوز آسف تھا۔ اس کا مقبرہ سری نگر میں ہے اور نظریہ یہ ہے کہ یوز آسف اور یسوع ایک ہی شخصیت کے نام ہیں۔ (اگرچہ) اس نظریے نے (بہت سے) کشمیری مسلمانوں کو (فکری) پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے اور ان میں سے بہت سے اس نظریے

کو مسلمہ مذہبی عقائد کے خلاف سمجھتے ہیں لیکن قاہرہ یونیورسٹی الازہر کے سربراہ کے اس حتمی فیصلے کو بھی (نظرانداز نہیں کیا جا سکتا) جس میں کہا گیا ہے کہ:۔

جامعہ ازہر کا فیصلہ

"قرآن حکیم میں ایسی کوئی بات نہیں اور نہ پیغمبر اسلام کی مقدس احادیث میں کوئی ایسی شہادت ملتی ہے جو اس عقیدے کے صحیح ہونے پر دلالت کرتی ہو کہ حضرت مسیحؑ کو مع جسم عنصری آسمانی پر اٹھا لیا گیا جہاں وہ ابھی تک بیٹھے ہیں اور دل بھی اس عقیدے کو قبول نہیں کرتا۔ حضرت مسیحؑ کے متعلق قرآنی آیات یہ ظاہر کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے طبعی موت کا وعدہ کیا تھا پس اس نے ان کی زندگی کا دور مکمل کر کے انہیں وفات دے دی۔ جو شخص حضرت مسیحؑ کے مع جسم آسمان پر اٹھائے جانے کا انکار کرتا ہے وہ کوئی بے دلیل اور بے ثبوت بات نہیں کہتا نہ وہ اسلامی تعلیم کے دائرے سے باہر جاتا ہے۔ اس کا یہ عقیدہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی نظروں میں بے داغ ہے۔" (1-A)

تھوما حواری کی شہادت

رابرٹ گریوز لکھتے ہیں کہ:۔ "اس کے ساتھ ہم ان روایات کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتے جو تھوما حواری سے تعلق رکھتی ہیں اور جن کی رو سے خود تھوما نے یسوع کو سری نگر میں دفن کیا تھا۔" (2)

دوسری صدی کے آخر میں ایک بہت بڑا مسیحی بزرگ گزرا ہے جس کا نام بشپ ہپولائی ٹس (.Bishop Hippoly tus) تھا۔ بشپ موصوف نے خود تھوما حواری کی انجیل کا مطالعہ کرنے کے بعد لکھا تھا کہ:۔

"تھوما حواری نے پارتھیوں، فارسیوں اور ہندوستانیوں میں تبلیغی خدمات سرانجام دیں۔ انہیں ہندوستان کے ایک مقام کیلامانیہ (میلا پور۔ مدراس) میں نیزہ

مار کر شہید کر دیا گیا اور وہیں دفن کر دیا گیا"۔ (3)

کیا تھوما حواری اور حضرت مسیحؑ دونوں بیک وقت ہندوستان میں موجود تھے؟ مورخ رابرٹ گریوز اور ان کے شریک مصنف جوشوا پوڈ رو اس سوال کا ان الفاظ میں جواب دیتے ہیں:۔

"تھوما حواری حضرت مسیحؑ کے مشورے پر بادشاہ ٹیکسلا کے شاہی ٹریڈ کمشنر ابانیس (Abbanes) کے ساتھ شمال مغربی ہندوستان گیا تھا جہاں اس وقت بادشاہ گنڈا فورس (Gunda Phorus) اس علاقے کا حکمراں تھا۔ ٹیکسلا میں ایک کتبہ دستیاب ہوا ہے جس کی عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ ۴۷ء میں بادشاہ گنڈا فورس اس علاقے پر حکومت کرتا تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب بادشاہ گنڈا فورس کی بیٹی کی شادی کی تقریب منعقد ہوتی ہے اور تھوما کی انجیل (Acts of Thomas) کی رو سے حضرت مسیحؑ اس تقریب میں شرکت کرتے ہیں جبکہ اس شہر (ٹیکسلا) میں حواری تھوما پہلے سے موجود تھے۔ (4)

علامہ السعید الصادق کی شہادت

اس کے بعد "جی سزان روم" کے فاضل مصنف چوتھی صدی ہجری کے ایک مشہور مسلمان فاضل السعید الصادق اور ان کی عالمانہ کتاب "اکمال الدین" کے حوالے سے حضرت مسیحؑ کے آخری دور کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ السعید الصادق کا پورا نام تھا السعید الصادق ابی جعفر محمد ابن علی ابن حسین ابن موسیٰ ابن بئ بویاہا القمی مگر مشہور السعید الصادق کے نام سے ہیں انہوں نے تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں زندگی گذاری اور خراسان میں ۳۸۱ھ (۹۶۲ء) میں وفات پائی۔ السعید الصادق قریباً تین سو کتابوں کے مصنف تھے ان میں سب سے زیادہ مشہور کتاب "اکمال الدین و تمام النعمت فی اثبات و کشف الحیرت" ہے جسے شاید بنظر اختصار "اکمال الدین" کہا جاتا ہے۔ یہ کتاب سب سے پہلے آغا میرباقر نے ایران سے ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۲ء میں شائع کی تھی۔ ہیڈلبرگ یونیورسٹی کے پروفیسر میکس

ملر (Prof : MAX Muller) نے جرمنی زبان میں اس کا ترجمہ کیا تھا اس سے اس کتاب کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

("شیخ السعید الصادق نے "صحیفہ یوز آسف" کا عربی میں ترجمہ کیا ہے اور لکھا ہے) کہ یوز آسف نے فرشتے کی آواز سنی جب وہ سری لنکا کے شہر شولابتھ (Shola Beth) میں تھے۔ آواز سن کر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ کرتے ہوئے عرض کیا:۔

"میں آپ کا حکم بجالاؤں گا اے میرے قادر مطلق خدا! مجھے اپنی رضا کی روشنی بخش دیجئے۔ میں آپ کی حمد کرتا ہوں، میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری رہنمائی فرمائی اور مجھے ہدایت عطا فرمائی۔"

تب فرشتے نے اسے اس ملک کو خیرباد کہنے کی ہدایت کی اور وہ اس ملک کو چھوڑ کر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ (5)

یوز آسف نے اپنا سفر جاری رکھا۔ آخر وہ ایک بڑی وادی میں پہنچ گیا اس نے نظر اٹھائی تو سامنے ایک چشمہ اور اس کے پاس ایک درخت نظر آیا۔ وہ درخت بہت خوبصورت تھا اس کی شاخیں بہت زیادہ تھیں۔ یہ درخت میٹھے پھلوں سے لدا ہوا تھا۔ بے شمار پرندے اس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نظارے سے وہ بہت مسرور ہوا۔ اس منظر کی اس نے اس طرح تشریح کی کہ درخت کو اس بشارت سے تشبیہ دی جس کی طرف وہ لوگوں کو دعوت دیتا تھا اور چشمے کو تعلیم سے اور پرندوں کو ان لوگوں سے تشبیہ دی جو اس (یسوع) کے حلقے میں بیٹھتے ہیں اور وہ مذہب اختیار کرتے ہیں جس کی طرف وہ دعوت دیتا ہے۔ (6)

اس طرح وہ متعدد شہروں کی سیاحت کرتا ہوا کشمیر نامی ملک میں پہنچا۔ اس نے اس ملک میں دور دور تک سفر کیا اور پھر وہیں مقیم ہو گیا۔ باقی زندگی وہیں گزاری حتیٰ کہ موت سے ہمکنار ہوا، اس کی روح نے اس کے جسد خاکی کو چھوڑ دیا اور وہ

(ابدی) روشنی کی طرف بلند ہو گیا۔ (7)

مورخ کشمیر کی شہادت

اس روشنی میں ذرا سا آگے بڑھئے۔ کیا یہ غور طلب بات نہیں کہ جو بات چوتھی صدی ہجری کے ممتاز عالم السعید الصادق کہہ رہے ہیں جن کی کتاب "اکمال الدین" کے اقتباسات رابرٹ گریوز اور جوشوا پوڈ رو نے پیش کئے ہیں بالکل وہی بات ایک اور قدیم مورخ اور عالم ملا نادری" کہہ رہے ہیں جو مغلیہ دور کے عالم اور مورخ تھے ان کا حوالہ بھی ان ہی دونوں مورخوں رابرٹ گریوز اور جوشوا پوڈ رو نے دیا ہے ملا نادری" فرماتے ہیں:۔

"بادشاہ گوپانندا جو گوپادت کے لقب سے اپنے باپ کا جانشین ہوا اس کے دور حکومت میں کشمیر میں بہت سے مندر تعمیر کئے گئے اور "تخت سلیمان" نامی عمارت کی مرمت کی گئی۔ اس بادشاہ کے دور حکومت میں یوز آسف اس پاک وادی (کشمیر) میں آئے وہ نبی ہونے کے مدعی تھے' دن رات اللہ کی عبادت میں بسر کرتے تھے۔ انہوں نے پاکبازی اور روحانیت کے اعلیٰ مدارج طے کئے۔ وہ کشمیر کے لوگوں کو خدا کا پیغام پہنچاتے تھے۔ ملا نادری" آگے چل کر لکھتے ہیں کہ تخت سلیمان نامی عمارت کی سیڑھیوں پر فارسی میں اس مضمون کی عبارت کندہ تھی کہ:۔

"یوز آسف یسوع تھے جو بنی اسرائیل کی طرف بطور پیغمبر مبعوث ہوئے تھے۔"

اصل فارسی الفاظ یہ ہیں:۔

"ایشاں یسوع پیغمبر بنی اسرائیل است" (8)

قدیم ہندو مورخ کی شہادت

اب تھوڑا سا اور آگے بڑھئے! کیا یہ امر اور بھی زیادہ باعث تعجب نہیں کہ الشیخ السعید الصادق اور ملا نادری" کے علاوہ سنسکرت کی قدیم ترین کتاب "بھوشیا مہاپران"

بھی یہی کہتی ہے کہ حضرت مسیحؑ کشمیر آئے تھے اور یہیں مقیم ہو گئے تھے۔ کیا یہ سب اتفاقات ہیں یا ان مختلف العقیدہ مورخوں اور عالموں نے جو مختلف زمانوں سے تعلق رکھتے ہیں آپس میں کوئی سازش کر لی تھی کہ سب ایک جیسی بات کہہ رہے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ وہ مسیحی مورخ جو کہتے ہیں کہ "(بعض) مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہمیں سخت ناگوار گزرتا ہے کہ مسیحؑ کشمیر میں دفن ہیں" اب وہی اس دعوے کی تصدیق کرنے لگے ہیں اور اس کی تائید میں شہادتیں پیش کرتے ہیں چنانچہ یہ دونوں فاضل مصنف اپنی کتاب میں سنسکرت زبان کی قدیم ترین کتاب "بھوشیا مہاپران" کا ایک اقتباس درج کرتے ہیں جس کا اردو ترجمہ یہ ہے کہ:۔

راجہ ایک روز کوہ ہمالہ کے دامن میں واقع ایک علاقے کی طرف گیا وہاں اس نے ایک بزرگ کو دیکھا جس کا رنگ خوشنما تھا اور وہ سفید لباس میں ملبوس تھا۔ راجہ نے اس سے دریافت کیا کہ تم کون ہو؟ بزرگ نے جواب دیا کہ میں ایک عورت کے بطن سے پیدا ہوا ہوں؟ جس پر راجہ نے حیرت کا اظہار کیا۔ (9)

یہاں تھوڑا سا ٹھہر کر سوچئے۔ ہر شخص عورت ہی کے بطن سے پیدا ہوتا ہے پھر حضرت مسیحؑ نے یہ کیوں کہا کہ میں عورت کے بطن سے پیدا ہوا ہوں؟ اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز بات یہ کہ حضرت مسیحؑ کے اس جواب پر راجہ نے تعجب کا اظہار کیوں کیا؟ اس میں حیرت کی کیا بات تھی کہ "میں عورت کے بطن سے پیدا ہوا
وں۔" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سنسکرت کی کتاب میں حضرت مسیحؑ کا بیان درج
نے والے سے سہو ہو گیا یا وہ بات کو سمجھ نہ سکا چونکہ بات بظاہر ناممکن تھی اس
سنسکرت کتاب کے مصنف نے گول مول بیان کر دی ورنہ حضرت مسیحؑ نے یہی
تھا کہ میں ایک کنواری عورت کے بطن سے پیدا ہوا ہوں۔ یہ فقرہ یقیناً ایسا ہے
سن کر ہر شخص کو تعجب ہوتا ہے اور راجہ کو بھی

تعجب ہوا۔ دوسری بات یہ کہ دریافت کرنے پر ہر شخص اپنے باپ کا نام بتاتا ہے کہ میں فلاں کا بیٹا ہوں لیکن راجہ کے دریافت کرنے پر اس بزرگ نے اپنے باپ کا نام نہیں لیا بلکہ اپنے آپ کو ماں سے منسوب کیا۔ آخر کیوں؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس بزرگ کا باپ نہیں تھا اور یہ وہی بزرگ تھا جس کا نام یسوع (مسیح) ہے اور جو کنواری (حضرت مریمؑ) کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ حضرت مسیحؑ کے علاوہ اور کوئی نبی یا ولی کنواری کے بطن سے پیدا نہیں ہوا جو کشمیر بھی آیا ہو۔

مسیحؑ مسند اقتدار پر

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت مسیحؑ کی شخصیت سے متاثر ہو کر کشمیر کا فرماں روا ان کی بہت عزت کرتا اور نہایت تکریم سے پیش آتا تھا جیسا کہ آپ آگے چل کر دیکھیں گے کہ پہلی ملاقات کے بعد جب حاکم ریاست رخصت ہونے لگا تو اس نے جناب مسیحؑ کو سلام کیا۔ پھر آپ یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ ریاست کے فرماں روا نے جب ایران سے سلیمان نامی انجینئر کو بلوا کر "تخت سلیمان" کی مرمت پر مامور کیا تو ریاست کے ہندوؤں نے اعتراض کیا کہ سلیمان غیر مذہب سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس سے تخت سلیمان کی مرمت نہ کروائی جائے اس پر حکمران نے یہ معاملہ بغرض فیصلہ حضرت مسیحؑ کی خدمت میں پیش کیا اور جب انہوں نے فیصلہ دیا کہ تخت سلیمان کی مرمت سلیمان انجینئر ہی سے کروائی جائے تو حاکم ریاست نے یہ فیصلہ قبول کر لیا' اس کا پورا احترام کیا اور حکم دیا کہ سلیمان ہی اس عمارت کی مرمت کرے۔(10)

اس طرح حضرت مسیحؑ کو ریاست میں امتیازی مقام حاصل ہو گیا' آپؑ کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہونے لگا مگر اس ہر دلعزیزی اور عزت و وجاہت نے آپؑ کے مخالفوں کا ایک گروہ بھی پیدا کر دیا' یہ کشمیر کے علمائے یہود تھے جو دین موسوی ترک کر کے بت پرستی اختیار کر چکے تھے۔ یہ لوگ حضرت مسیحؑ کے سخت دشمن ہو گئے کیونکہ دنیا کے تمام انبیاء کی طرح جناب مسیحؑ بھی بندگان خدا کو خدائے

واحد کی پرستش و عبادت کی تعلیم دیتے تھے۔ کشمیر کے یہ مذہبی اجارہ دار محسوس کر رہے تھے کہ اس نووارد نبی کی تعلیم ان کا مذہبی و سماجی اقتدار خاک میں ملا دے گی چنانچہ انہوں نے کشمیر کے حکمران سے آپؑ کی شکایتیں کرنی شروع کیں۔ آخر ایک روز ریاست کا فرماں روا حضرت مسیحؑ کے پاس آیا اور آپؑ کی تعلیم کے بارے میں کچھ سوالات کئے۔ آپؑ کے جوابات اتنے معقول اور تسلی بخش تھے کہ حاکم وقت نے آپؑ کے مخالفوں کو دھتکار دیا۔

عجیب بات ہے کہ ہمیں یہ اطلاع بھی "جی سزان روم" نامی کتاب کے فاضل مصنف ہی دیتے ہیں کہ:۔

"راجہ نے وہاں کے بے دین مذہبی رہنما کو اس کے عہدے سے برطرف کر دیا اور اس کی جگہ حضرت مسیحؑ کو گمراہوں کی اس مظلوم سرزمین پر نیا سربراہ مقرر کر دیا۔(11)

اس طرح کشمیر کی وادی کے مذہبی و سماجی امور کا انتظام و انصرام حضرت مسیحؑ کے پاس آ گیا اور اب ایک حد تک اقتدار کے مالک وہی تھے۔ یوں اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ پورا ہو گیا جو اس نے حضرت مریمؑ سے اس وقت کیا تھا جب انہیں ایک پاک بیٹے کی بشارت دی تھی اور یوں فرمایا تھا کہ:۔

وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (آل عمران آیت نمبر ۴۵)

(یعنی وہ (عیسیٰ) دنیا اور آخرت (دونوں) میں صاحب وجاہت ہو گا صاحب منزلت ہو گا اسے عزت و تکریم عطا کی جائے گی۔)

پس حضرت مسیحؑ کو وادی کشمیر میں جو عزت و اقتدار حاصل ہوا وہ اسی لئے تھا تاکہ دنیا دیکھ لے کہ آپؑ نے محض کس مپرسی اور مسکینی کی زندگی گزار کر اس جہان سے رخت سفر نہیں باندھا بلکہ کس مپرسی اور مسکینی کی زندگی کے بعد آپؑ پر ایک ایسا دور بھی آیا جب بادشاہ آپؑ کے کپڑوں سے برکت ڈھونڈتے تھے اور ایک پورے ملک (کشمیر) پر آپؑ کا حکم چلتا تھا۔ اب یہ عقدہ کھلا کہ آپؑ کو "شہزادہ نبی"

کیوں کہا جاتا تھا۔

مسیحؑ خدا کی پناہ میں

یہ تو تاریخی روایت تھی اور اس کے راوی بھی وہ لوگ ہیں جن کا اس روایت سے کوئی ذاتی مفاد یا ذاتی غرض بھی وابستہ نہیں کہ خواہ مخواہ وہ یہ روایت گھڑ لیتے۔ اس کے آخری دو راوی وہ ہیں جو حضرت مسیحؑ کو جسد خاکی کے ساتھ آسمان پر زندہ تسلیم کرتے ہیں اس لئے یہ روایت تو سرا سران کے خلاف جارہی ہے مگر اس کے باوجود انہوں نے اسے اپنی کتاب میں درج کیا کیونکہ اس سے اختلاف کرنے کے باوجود وہ اسے درست روایت سمجھتے تھے۔ تاریخ سے قطع نظر کرتے ہوئے جب ہم حضرت مسیحؑ کے حالات زندگی معلوم کرنے کے لئے قرآن حکیم کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ایک ایسی حقیقت کی طرف ہماری رہنمائی ہوتی ہے کہ اس کے بعد کسی دوسرے ذریعہ معلومات کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ یہ قرآن حکیم کی ایک آیت ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ حضرت مسیحؑ کے حالات زندگی کے بارے میں ہمیں روشنی عطا فرماتا ہے تاکہ ہم اندھیرے میں ٹامک ٹوئے نہ مارتے پھریں۔

فرمایا:۔

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَآوَيْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ ○ (المومنون آیت نمبر ۵۰)

(یعنی ہم نے ابن مریم (عیسیٰ) اور ان کی ماں (مریم) کو (عظیم الشان) نشان بنایا اور دونوں کو ایسی جگہ پناہ دی جو بلند اور سرسبز و شاداب تھی۔)

اس آیت حکیمہ نے اس مسئلے کی ساری گرہیں کھول دیں:۔

(۱) اس ارشاد میں دو شخصیتوں کو پناہ دینے کا ذکر ہے ایک حضرت مسیحؑ اور دوسری حضرت مریمؑ۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ واقعہ حضرت مسیحؑ کی پیدائش کے بعد کا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کو اس وقت پناہ دی جب حضرت مسیحؑ پیدا

ہو چکے تھے اور پختہ عمر کو پہنچ چکے تھے۔ اگر ابھی حضرت مسیحؑ کی ولادت نہیں ہوئی تھی تو اللہ تعالیٰ یوں فرماتا کہ "ہم نے مریم کو پناہ دی" حضرت مسیحؑ کا ذکر نہ کرتا کیونکہ وہ تو ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے تھے مگر اللہ تعالیٰ دونوں کا ذکر فرما رہا ہے۔ پھر اس ارشاد میں پہلے حضرت مسیحؑ کا ذکر ہے' اس کے بعد حضرت مریمؑ کا یہ ترتیب بلا وجہ نہیں ہے۔ آخر حضرت مریمؑ کا پہلے ذکر کیوں نہیں کیا' حضرت مسیحؑ کا ذکر پہلے کیوں کیا؟ اس میں یہی نکتہ ہے کہ پناہ دینے کا واقعہ اس وقت پیش آیا جب حضرت مسیحؑ پیدا ہو چکے تھے اور پختہ عمر کو پہنچ چکے تھے اس لئے جو لوگ اس آیت کو حضرت مسیحؑ کے واقعہ ولادت سے متعلق کرتے ہیں وہ کھلی غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

(۲) دوسری نہایت اہم اور غور طلب بات یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ پناہ دینے کا ذکر کرتا ہے۔ فرماتا ہے کہ ہم نے ابن مریمؑ اور ان کی ماں کو پناہ دی۔ پناہ کی ضرورت ہمیشہ اس وقت پیش آتی ہے جب کوئی مصیبت آپڑے اور انسان کی جان کو خطرہ درپیش ہو بلا شبہ شیطان کی وجہ سے بھی پناہ کی ضرورت پیش آتی ہے اور اس سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی جاتی ہے لیکن یہاں جسمانی پناہ کا ذکر ہو رہا ہے اور قرینہ بتا رہا ہے کہ حضرت مسیحؑ اور حضرت مریمؑ پر کوئی بہت بڑی مصیبت پڑی تھی جس سے محفوظ رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے دونوں کو پناہ دی اس کی تائید و تصدیق انجیل سے بھی ہوتی ہے چنانچہ گرفتاری کی شب حضرت مسیحؑ باغ میں اپنے شاگردوں کو دعا کرنے کی ہدایت کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ:۔

"میری جان نہایت غمگین ہے یہاں تک کہ مرنے کی نوبت پہنچ گئی ہے....."

"اے باپ! تجھ سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اس پیالے کو میرے پاس سے ہٹا لے ---- تو بھی جو میں چاہتا ہوں ---- وہ نہیں ---- بلکہ جو تو چاہتا ہے وہی ہو" (مرقس باب نمبر ۱۴ آیت نمبر ۳۶)

یعنی میری نہیں بلکہ تیری مرضی پوری ہو۔

اور پھر جب آپؑ کو صلیب پر چڑھا دیا گیا تو آپؑ نے بہت درد و کرب سے دعا کی کہ:۔

ایلی ایلی! لما شبقتنی (اے اللہ! اے اللہ) تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا (متی باب نمبر ۲۷ آیت نمبر ۴۶)

ہر شخص کا دل پکار اٹھتا ہے کہ یہ تھا وہ وقت جب حضرت مسیحؑ پر بہت سخت مصیبت پڑی تھی اور یہی وہ وقت تھا جب حضرت مسیحؑ کو پناہ کی ضرورت تھی اور اسی مصیبت کی وجہ سے آپؑ فریاد کرتے تھے کہ "اے اللہ تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا" مگر اللہ تعالیٰ قرآن حکیم کے ذریعے ہمیں اطلاع دیتا ہے کہ اس نے مسیحؑ کو ہر گز نہیں چھوڑا بلکہ صلیبی موت سے بچا کر اسے اور اس کی ماں دونوں کو فلسطین سے بحفاظت نکال لیا اور اپنی پناہ میں لے لیا۔

(۳) جس جگہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیحؑ اور ان کی والدہ کو پناہ دی اس کی دو علامتیں بیان کیں۔ پہلی یہ کہ وہ جگہ بہت بلند تھی۔ دوسری علامت یہ بیان کی کہ نہایت سرسبز و شاداب تھی۔ بلندی پر ہونے کی وجہ سے بہت ٹھنڈی جگہ تھی اور سرسبزی و شادابی کی وجہ سے ایسی حسین تھی کہ اسے جنت نظیر کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ سرزمین کشمیر کے علاوہ اور کون سی ہو سکتی ہے جہاں حضرت مسیحؑ کا تشریف لے جانا ثابت ہو چکا ہے۔

(۴) ایک اور نکتہ بھی غور طلب ہے، جب اللہ تعالیٰ کسی کو پناہ دیتا ہے تو اس طرح دیتا ہے کہ پھر وہ دشمنوں کی گرفت سے مکمل طور پر آزاد و محفوظ ہو جاتا ہے مگر انجیل اور تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت مسیحؑ کی پیدائش کے بعد سے لے کر واقعہ صلیب کے وقت تک ان پر مسلسل مصائب و آلام کی بارش ہوتی رہی حتیٰ کہ انہیں صلیب پر چڑھا دیا گیا۔ پس ثابت ہوا کہ واقعہ صلیب تک پناہ دینے کا واقعہ ظاہر نہیں ہوا تھا۔ صلیب پر چڑھائے جانے کے بعد آپؑ اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آ گئے چنانچہ یہ پناہ سب سے پہلے تو اس طرح ظاہر ہوئی کہ آپؑ پر شدید قسم کی بیہوشی

طاری ہو گئی، جو موت سے مشابہ تھی اور دشمن نے آپؑ کو مردہ سمجھ کر صلیب سے اتار لیا اس طرح آپؑ کی جان بچ گئی کیونکہ آپؑ اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آ چکے تھے۔ اس پناہ کا مکمل ظہور اس وقت ہوا جب آپؑ کشمیر پہنچ گئے یہاں آپؑ کو دشمنوں سے مکمل طور پر پناہ مل گئی اس سرزمین پر آنے کے بعد آپؑ کو ہر دلعزیزی ملی بادشاہ وقت نے اظہار نیاز مندی کیا، عروج و اقتدار ملا اور یہ دور زندگی کے آخری لمحے تک قائم و برقرار رہا پس یہ تھی وہ پناہ جو حضرت مسیحؑ اور آپؑ کی والدہ کو دی گئی اور حضرت مسیحؑ اس سرزمین پر طویل مدت عزت و وقار اور حاکمانہ شان کے ساتھ زندہ رہے۔

(۳) یہاں پہنچ کر ہماری نگاہ مسئلے کے ایک اور پہلو کی طرف جاتی ہے۔ اب تک یہ کہا جاتا تھا کہ جب دشمنوں نے حضرت مسیحؑ کو گرفتار کر کے صلیب پر چڑھانا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں آسمان پر اٹھا کر اپنی پناہ میں لے لیا کاش یہ کہانی نویس حضرات قرآن حکیم کی اس آیت پر غور کرتے کہ:۔

"ہم نے مسیحؑ اور اس کی ماں کو ایسی زمین پر پناہ دی جو بلند اور سرسبز و شاداب تھی۔" (سورۃ المومنون آیت نمبر ۵۰)

قرآن حکیم کی یہ آیت نہایت وضاحت سے بتا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیحؑ کو دشمن کے ہاتھوں سے محفوظ رکھنے کے لئے آسمان پر پناہ نہیں دی بلکہ زمین پر پناہ دی جو بلندی میں آسمان سے باتیں کر رہی تھی اور سرسبزی و شادابی کی وجہ سے جنت نظیر تھی۔

کشمیر سے اعلان مسیحیت

گزشتہ صفحات میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ مہاراجہ کشمیر اور حضرت مسیحؑ کے درمیان بہت سی ملاقاتیں ہوئیں اور اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ ان میں سے کسی ابتدائی ملاقات کی روداد سنسکرت کی قدیم کتاب "بھوشیا مہاپران" کے مصنف نے بیان کی ہے جسے "Jesus in rome" نامی کتاب کے مصنفوں نے بھی

اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ اس روداد کے مطابق راجہ کے ایک سوال کے جواب میں حضرت مسیحؑ نے کہا کہ "وہ اپنی زبان سے وہی بات کہتا ہے جو سچی ہوتی ہے اور وہ مذہب کو پاک صاف کرتا ہے۔" اس پر راجہ نے پھر پوچھا کہ آپ کا مذہب کیا ہے؟ حضرت مسیحؑ نے جواب دیا کہ "اے بادشاہ! جب سچائی عنقا ہو گئی اور ملچھ (غیر ہندوؤں) کے ملک میں برائیاں اور گناہ اپنی انتہا کو پہنچ گئے تب میں ظاہر ہوا۔ میری (تبلیغ) کی وجہ سے گنہگار اور ظالم لوگ مجھ سے بگڑ گئے اور (انہوں نے خیال کیا کہ) میری وجہ سے وہ مصیبت میں پڑ گئے ہیں پس انہوں نے مجھے بہت دکھ دئے اور مصیبتوں میں مبتلا کر دیا (یہ واقعہ صلیب کی طرف اشارہ ہے) راجہ نے دوبارہ سوال کیا کہ آپ کا مذہب کیا ہے؟ حضرت مسیحؑ نے جواب دیا کہ میں باہمی محبت، راست بازی اور دل کی پاکیزگی کی تعلیم دیتا ہوں اس وجہ سے **مجھے عیسیٰ مسیح (ISA MASIH) کہا جاتا ہے۔** راجہ انہیں سلام کہہ کر واپس چلا گیا۔(12)

اس بیان سے دو باتیں واضح ہو گئیں:۔

(الف) حضرت مسیحؑ راجہ کو بتاتے ہیں کہ "میرے کام" کی وجہ سے میری قوم کے گنہگار اور ظالم لوگ پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ ذرا غور کیجئے کہ "میرے کام" سے کیا مراد ہو سکتی ہے؟ حضرت مسیحؑ نے اپنی زندگی میں ایک ہی کام کیا تھا جس سے آپؑ کی قوم کے لوگوں کو تکلیف ہوئی تھی اور وہ کام تھا آپؑ کا تبلیغی مشن۔

(ب) پھر حضرت مسیحؑ فرماتے ہیں کہ دوسری طرف ان کے ہاتھوں مجھے بہت مصیبتیں اٹھانی پڑیں۔ اب بات بالکل صاف ہو گئی کہ جب حضرت مسیحؑ نے نبوت کا اعلان کیا اور اپنی قوم کے لوگوں خصوصاً بڑے لوگوں کو بدیوں اور گناہوں کے کاموں سے روکا تو وہ آپؑ سے بگڑ گئے اور آپؑ کو ایذائیں دینی شروع کر دیں، یہاں تک کہ صلیب پر چڑھا دیا۔ اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپؑ فرماتے ہیں کہ انہوں نے مجھے سخت دکھ دیئے۔ چونکہ چند سال قبل اس علاقے پر رومی فوجیں حملہ

آور ہو چکی تھیں اور رومی حضرت مسیحؑ کے دشمن تھے اس لئے آپؑ نے کھل کر واقعہ صلیب کا ذکر نہیں کیا البتہ دوران گفتگو جب آپؑ کو یقین ہو گیا کہ راجہ کا رویہ ہمدردانہ بلکہ عقیدتمندانہ ہے تو آخر آپؑ نے اپنا اصلی نام ظاہر کر دیا کہ "مجھے مسیح کہا جاتا ہے۔" پس سنسکرت کی شہرہ آفاق کتاب "بھوشیا مہا پران" کے مصنفوں اور "جی سزان روم" کے مصنفوں رابرٹ گریوز اور جوشوا پوڈرو کی تحریروں کی رو سے بھی ثابت ہو گیا کہ یوز آسف دراصل حضرت مسیحؑ تھے، اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہوں ان پر اور سلام۔

ooo

حوالہ جات

(1) Jesus in Rome By Robert Graves Ang Josh ua Podro, Published By Cassel And Company Ltd. London, P-69

(1-A) "Jesus In Rome" P-69

(2) "Jesus In Rome" P-70

(3) "Jesus In Rome" P-70

(4) "Jesus In Rome" P-71

(5) "اکمال الدین" صفحہ نمبر ۳۵۷ مولفہ السعید الصادق مترجمہ مولوی عطا الرحمان (مطبوعہ کلکتہ)

(6) "اکمال الدین" صفحہ نمبر ۳۵۸ " " "

(7) "اکمال الدین" صفحہ نمبر ۳۵۹ " " "

(8) تاریخ کشمیر صفحہ نمبر ۶۹ مولفہ ملا نادی بحوالہ "جی سزان روم" صفحہ نمبر 75

(9) "Jesus In Rome" P-75

(10) "Jesus In Rome" P-75

(11) "Jesus In Rome" P-77

(12) "Jesus In Rome" P-76

حضرت مریمؑ کی رُودادِ سفر

اس کی ماں اور اس کا وہ شاگرد جس سے وہ سب سے زیادہ محبت
کرتا تھا اس کے قریب کھڑے تھے۔ اس نے پہلے اپنی ماں کو
مخاطب کیا اور کہا کہ والدۂ محترمہ! یہ آپ کا بیٹا ہے پھر اپنے شاگرد
کو مخاطب کیا اور اپنی ماں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ
دیکھو! یہ تمہاری ماں ہے۔

یہ حضرت مسیحؑ تھے جو اپنی مقدس والدہ اور اپنے عزیز ترین شاگرد یوحنا حواری سے مخاطب تھے۔ یہی وہ کنجی ہے جو ذہن کے اس قفل کو کھول دیتی ہے کہ جناب مسیحؑ کے واقعہ صلیب کے بعد حضرت مریمؑ پر کیا بیتی؟ افسوس کہ اصل حقیقت کو سمجھنے کے لئے اس طرف توجہ نہیں کی گئی کہ واقعہ صلیب کے وقت جناب مسیحؑ نے اپنی والدۂ محترمہ کے بارے میں کوئی وصیت کی تھی؟ اس سلسلے میں انجیل کی طرف رجوع کرنا پڑے گا چنانچہ کتاب مقدس کہتی ہے کہ:۔

مسیح کی وصیت

اور یسوع کی صلیب کے پاس اس کی ماں اور اس کی ماں کی بہن مریم (کلوپاس کی بیوی) اور مریم مگدلینی کھڑی تھیں ○ یسوع نے اپنی ماں اور اس شاگرد کو جس سے محبت رکھتا تھا پاس کھڑے دیکھ کر ماں سے کہا کہ اے عورت دیکھ تیرا بیٹا یہ ہے ○ پھر شاگرد سے کہا دیکھ تیری ماں یہ ہے اور اسی وقت سے وہ شاگرد اسے اپنے گھر لے گیا (1)

گویا انجیل نے نشاندہی کر دی کہ واقعہ صلیب کے وقت جناب مسیحؑ کی والدہ صلیب

کے قریب موجود تھیں جو ایک قدرتی بات تھی، جناب مسیحؑ نے اپنے ایک شاگرد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی والدہ کو وصیت کی کہ وہ اسے اپنا بیٹا بنا لیں یعنی اسے وہ مقام دیں جو بیٹے کا ہوتا ہے اور اس شاگرد کو وصیت کی کہ وہ آپؑ کی والدہ کو اپنی والدہ بنا لے یعنی انہیں وہ مقام دے جو ماں کا ہوتا ہے پھر انجیل تصدیق کرتی ہے کہ جناب مسیحؑ کی والدہ اور آپؑ کے شاگرد دونوں نے آپؑ کی وصیت پر عمل کیا اور آپؑ کا یہ شاگرد جس سے آپؑ محبت کرتے تھے حضرت مریمؑ کو اپنے ساتھ لے کر کسی دور دراز مقام کی طرف چلا گیا۔

تاریخ نے حضرت مسیحؑ کے اس شاگرد کے نام کی بھی نشاندہی کر دی جس کے سپرد آپؑ نے اپنی والدہ کو کیا تھا چنانچہ مسیحیت کے بارے میں ایک تحقیقی کتاب "ارلی سائنٹس آف کرسچیانٹی" میں صراحت کی گئی ہے کہ:۔

"ہم جانتے ہیں کہ جناب مسیحؑ نے واقعہ صلیب کے موقع پر اپنی والدہ کو اپنے سب سے چہیتے حواری سینٹ جان (جناب یوحنا) کے سپرد کر دیا تھا اور حضرت مریمؑ سے کہا تھا کہ والدۂ محترمہ! اس امر کا خیال رکھئے گا کہ یہ آپ کا بیٹا ہے اور دوسری طرف جناب یوحنا سے کہا تھا کہ تم بھی خیال رکھنا کہ یہ تمہاری والدہ ہیں تب وہ حواری (جناب یوحنا) حضرت مریمؑ کو لے کر روانہ ہو گئے۔ سب جانتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کے واقعہ صلیب کے بعد یروشلم کے یہودیوں نے حضرت مسیحؑ کے حواریوں کو ایذائیں پہنچانی شروع کر دی تھیں ایسے ہی حواریوں میں جناب یوحنا کا بھائی بھی شامل تھا جسے یہودیوں نے تشدد کرنے کے بعد قتل کر دیا تھا اس غصہ اور جھنجھلاہٹ کی اصل وجہ یہ تھی کہ جناب یوحنا حضرت مریمؑ کو لے کر اس خوفناک شہر سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اسے ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ گئے تھے جہاں حضرت مسیحؑ کو صلیب پر چڑھایا گیا تھا (2)

حضرت مریمؑ کی فلسطین سے روانگی

جناب یوحنا حضرت مریمؑ کو لے کر یروشلم سے نکل گئے اور کچھ مدت فلسطین کے

دور دراز مقامات میں گزاری جو بعض روایات کے مطابق ڈیڑھ سال اور بعض کے مطابق اس سے بھی زیادہ ہے، اس کے بعد یوحنا حواری نے اس محترم خاتون کے ساتھ سفر کا آغاز کیا۔ تاریخ میں اس سفر کی روداد بکھری ہوئی کڑیوں کی طرح منتشر حالت میں موجود ہے جو تلاش بسیار کے بعد مل جاتی ہے اس طرح تاریخ کا یہ مخفی باب سامنے آ جاتا ہے گویا اس کے لئے ہمیں مختلف کڑیوں کو باہم ملانا پڑے گا۔

حضرت مسیحؑ کے ایک معتمد حواری جناب فلپ نے اپنی یادداشتیں قلمبند کی تھیں جو حال ہی میں مصر سے دریافت ہو گئی ہیں اور (Acts of philip) کے نام سے کتابی صورت میں چھپ گئی ہیں اس انجیل نے بہت سے حقائق کو پہلی بار بے نقاب کیا ہے اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے بلکہ انکشاف کیا گیا ہے کہ جب فلپ "پارتھیا" میں داخل ہوا تو اس نے اس علاقے کے ایک شہر میں پطرس اور یوحنا کو دیکھا اور ان سے ملاقات بھی کی(3)

سب جانتے ہیں کہ پارتھیا وہ علاقہ تھا جو دریائے فرات سے جانب مشرق واقع تھا اور جس میں عراق کے مشرقی علاقے سے لے کر ایران، افغانستان اور ہندوستان کا شمال مغربی علاقہ شامل تھا۔ موجودہ صوبہ سرحد اور کشمیر بھی پارتھیا میں شامل تھے گویا فلپ نے حضرت مسیحؑ کے حواریوں پطرس اور یوحنا سے دریائے فرات کے مشرقی علاقے میں ملاقات کی تھی اور یہ حواری فلسطین کو خیرباد کہہ کر پارتھیا میں آ گئے تھے۔ حضرت مریمؑ بھی اس سفر میں جناب یوحنا کے ساتھ تھیں اور اس وقت تک ساتھ رہیں جب تک حضرت مسیحؑ آپ سے آ نہیں ملے۔ یہ صرف ہمارا دعویٰ نہیں کہ اس سفر میں یوحنا کے ساتھ حضرت مریمؑ بھی تھیں بلکہ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے چنانچہ مغرب کا ایک مسیحی مورخ بیان کرتا ہے کہ:۔

حواری یوحنا کی زندگی کا یہ دور جسے گمشدہ باب قرار دیا جاتا ہے بلاشبہ وہ دور ہے جب جناب یوحنا حضرت مریمؑ کے ہمراہ پارتھیا کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے یہ وہ وقت تھا جب حضرت مسیحؑ کے ماننے والوں پر روم کی حدود سلطنت میں اس قدر ظلم کیا جا رہا

تھا کہ ان کا وہاں آزادی سے زندگی گذارنا ممکن نہیں رہا تھا اور یہ ابتدائی مسیحی خوف زدہ ہو کر ہمسایہ سلطنت (پارتھیا) کی طرف ہجرت کر رہے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یہاں وہ بے خوف و خطر ہو کر حضرت مسیحؑ کی تعلیمات کے مطابق زندگی گذار سکتے ہیں اور اس پر آزادی سے عمل کر سکتے ہیں (4)

آپ نے دیکھ لیا کہ اس حوالے کی رو سے حضرت مریمؑ جیسی شخصیت تو کیا عام مسیحیوں کے لئے بھی اس سرزمین (فلسطین) میں زندگی گذارنا اجیرن ہو گیا تھا اور وہ اپنی جان و ایمان بچانے کے لئے ہمسایہ ملک پارتھیا میں ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے گویا حضرت مریمؑ کا فلسطین کو خیرباد کہہ کر ہجرت کا راستہ اختیار کرنا حالات کا منطقی نتیجہ تھا اور ان کے سامنے اس کے سوائے اور کوئی راہ نہیں تھی چنانچہ وہ جناب یوحنا کے ساتھ فلسطین سے مشرق کی طرف روانہ ہو گئیں مشرق کا یہ علاقہ پارتھیا کہلاتا ہے جو مشرقی عراق سے شروع ہوتا تھا عجیب بات ہے کہ اسی مشرقی عراق کے ایک مقام پر حضرت مریمؑ کی تشریف آوری کا واضح ثبوت ایک عظیم ایشیائی مورخ اور مسلمان عالم کی کتاب "بحار الانوار" سے بھی ملتا ہے چنانچہ یہ مسلمان عالم اور مورخ صراحت کرتا ہے کہ حضرت مسیح اور حضرت مریمؑ نے موجودہ کوفہ اور کربلا کے راستے عراق کا سفر کیا تھا (5)

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ واقعات کا دھارا کس طرح اپنے قدرتی رخ پر بہہ رہا ہے۔ یعنی واقعہ صلیب کے موقع پر حضرت مسیحؑ اپنی والدہ کو اپنے سب سے چہیتے شاگرد یوحنا کے سپرد کرتے ہیں جو انہیں لے کر فلسطین میں روپوش ہو جاتے ہیں کچھ مدت تک حضرت مریمؑ فلسطین میں زندگی گزارتی ہیں کیونکہ حضرت مسیحؑ صلیب سے بچ کر ابھی فلسطین میں ہیں پھر جب حضرت مسیحؑ فلسطین میں فرض تبلیغ ادا کر کے مشرق کی طرف روانہ ہوتے ہیں تو جناب یوحنا بھی حضرت مسیحؑ کی ہدایت کے مطابق حضرت مریمؑ کو لے کر پارتھیا (مشرق) کی طرف روانہ ہوتے ہیں آگے بڑھ کر ایک مقام آتا ہے جب جناب یوحنا حضرت مریمؑ کو حضرت مسیحؑ کے سپرد کر دیتے ہیں شام اور عراق پہنچ کر حضرت مریمؑ حضرت مسیحؑ کے ساتھ نظر آتی ہیں اور پھر دونوں ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور مشرقی ایشیاء کا

سفر طے کرتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ کی مستند اور مشہور کتاب "روضۃ الصفا" میں بیان کیا گیا ہے کہ:۔

"یسوع پیغمبر کو یہودیوں نے جھوٹا قرار دے دیا تھا اس طرح انہوں نے یسوع اور ان کی والدہ کو وطن چھوڑ کر کسی دوسری طرف پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔" (6)

مسیحؑ کے ساتھ سفر

یہاں جناب مسیحؑ کے آسمان پر اٹھائے جانے کا کوئی ذکر نہیں بلکہ یہ ممتاز مسلمان مورخ ہمیں بتاتا ہے کہ یہودیوں نے حضرت مسیحؑ کے راستے میں اس قدر دشواریاں پیدا کیں کہ وہ ترک وطن پر مجبور ہو گئے اور یہ نقل مکانی انہوں نے تنہا نہیں کی بلکہ ان کی والدہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔ پھر آگے چل کر ہمیں ایک اور روایت ملتی ہے یعنی قافلہ مزید آگے بڑھتا ہے اور اسی کتاب "روضۃ الصفا" میں بیان کیا گیا ہے کہ (واقعہ صلیب کے) کچھ مدت بعد جناب مسیحؑ اور ان کی والدہ نے دمشق کی طرف رخت سفر باندھا اور شہر کے ایک رئیس کے گھر میں کچھ دن قیام کیا۔ اس کے ساتھ یہ روایت بھی پڑھئے تو بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ:۔

"جناب توما حضرت مسیحؑ کے ایک حواری تھے یہ آپؑ کے ہم شکل و ہم شبیہہ بھی تھے آپؑ کے ساتھ ہی فلسطین سے اس طویل سفر پر روانہ ہوئے تھے اس سفر میں حضرت مسیحؑ کی والدہ جناب مریمؑ بھی آپؑ کے ہمراہ تھیں۔" (7)

گویا مسیحی اور مسلمان، مغربی اور ایشیائی غرض مختلف طبقات اور ممالک کے مورخوں کی خاصی بڑی تعداد صراحت کرتی ہے کہ حضرت مسیحؑ نے اپنی والدہ حضرت مریمؑ کے ہمراہ اپنا مشرقی سفر طے کیا اس سفر میں وہ (موجودہ) کوفہ و کربلا سے گذرے، دمشق کا سفر کیا اور پھر ایران کے راستے برصغیر پاک و ہند میں داخل ہو گئے یہاں پہنچ کر ایک اور نہایت اہم صداقت ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور وہ ہے چین کے صوبہ سنکیانگ میں بنو اسرائیل کی موجودگی جس کا بظاہر حضرت مریمؑ کے سفر مشرق سے کوئی تعلق نظر

نہیں آتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں نہایت گہرا تعلق ثابت ہوتا ہے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہودیت کے ابتدائی دور میں کچھ اسرائیلیوں نے چین کی طرف سفر اختیار کیا تھا بائبل میں چین کو (Sinim) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ عہد نامہ قدیم میں اس امر کی صراحت موجود ہے کہ "دیکھو! یہ یہودی بہت دور اور نشیبی علاقوں، شمال اور مغرب سے (Sinim) (چین) آئیں گے۔ (8)

جب ہم مطالعہ و تحقیق کا عمل جاری رکھتے ہیں تو آگے چل کر ہمیں اس حقیقت کا سراغ ملتا ہے کہ جناب مسیحؑ کا مشہور شاگرد تھامس (توما) ہندوستان سے چین کی طرف گیا تھا جبکہ اس تاریخی صداقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسیحیت اپنے ابتدائی دور میں ہی سمرقند کاشغر اور بکتریا (افغانستان) میں پھیل گئی تھی۔ (9)

حضرت مریمؑ کاشغر میں

ذرا اور آگے بڑھیں تو ایک اور حقیقت ہماری منتظر نظر آتی ہے یہ تاریخ کے ممتاز پروفیسر نکولس روئرچ (Prof. Nicholas Roerich) کی تحقیق ہے جس کے مطابق کشمیر لداخ اور وسط ایشیاء میں یہ روایت عام ہے کہ جناب مسیحؑ دنیا کے اس حصے میں تشریف لائے تھے۔ خود جناب مریمؑ کے بارے میں صراحت کی گئی ہے کہ چین کے علاقے سنکیانگ میں کاشغر سے چھ میل کے فاصلے پر ایک مزار ہے جسے مقدس کنواری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور یہ وہی کنواری ہیں جو یسوعؑ کی والدہ تھیں۔ بعض قدیم روایات کے مطابق جناب مسیحؑ کی گرفتاری کے بعد جناب مریمؑ کاشغر کی طرف ہجرت کر گئی تھیں وہیں ان کا مزار ہے جس پر ایک گنبد بھی بنا ہوا ہے ان کے عقیدت مند اب تک اس مزار پر گلہائے عقیدت پیش کرنے کی غرض سے حاضری دیتے ہیں (10)

سوال یہ ہے کہ اگر یہ مزار حضرت مریمؑ کا نہیں ہے تو صدیوں سے مسیحی لوگ اسے حضرت مریمؑ کا مزار سمجھ کر دور دور سے اس پر حاضری دینے کیوں آتے ہیں۔ اگر حضرت مسیحؑ لداخ، کشمیر، اور چین کے صوبہ سنکیانگ تشریف نہیں لے گئے تو وہاں آباد لوگوں میں یہ روایت کیسے مشہور ہو گئی کہ جناب مسیحؑ نے روئے زمین کے اس حصے کا بھی دورہ کیا

تھا۔ پھر زمانہ قدیم میں بلکہ اپنی تاریخ کے ابتدائی ایام میں بنی اسرائیل کا چین کے علاقوں میں نقل مکانی کر جانا اور بائبل میں اس کی بشارت موجود ہونا اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ جناب مسیحؑ ان علاقوں میں تشریف لائے تھے، آپ کے ساتھ آپؑ کی والدہ ماجدہ جناب مریمؑ بھی تھیں جو سنکیانگ (چین) کے شہر کاشغر میں وفات پا گئیں اور وہیں دفن ہوئیں اس شہر میں ان کا مزار اور اس پر تعمیر شدہ شاندار گنبد آج بھی موجود ہے۔ ان علاقوں میں عیسائیت کا ابتدائی ایام ہی میں فروغ پا جانا جیسا کہ ابھی تصریح کی جا چکی ہے اس دعوے کو مزید تقویت دیتا ہے کہ جناب مسیحؑ اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ اس سرزمین پر تشریف لائے اور یہاں آباد اسرائیلیوں کو پوری دلسوزی سے تبلیغ کی آپؑ کی جدوجہد اور مساعی تبلیغ کے نتیجے میں جناب مسیحؑ کی زندگی میں ہی اس سرزمین پر عیسائیت کو فروغ حاصل ہوا اور بہت سے بنی اسرائیل یہودیت کو خیرباد کہہ کر دین مسیحی میں شامل ہو گئے جو اس وقت سچا دین تھا۔

حضرت مریم کا مزار

یہاں پہنچ کر ایک اور حقیقت ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے جو بلاشبہ بڑی تاریخی حقیقت ہے۔ جدید تحقیق کی رو سے حضرت مسیحؑ اپنے مختصر سے قافلے کے ہمراہ ٹیکسلا سے گذر کر اپنی آخری منزل کی طرف جا رہے تھے کہ راولپنڈی کے قریب پہنچ کر مریم نامی ایک خاتون بیمار ہوئیں اور پھر وفات پا گئیں جس مقام پر انہیں دفن کیا گیا وہ بعد میں "مری" کے نام سے مشہور ہو گیا اور اب پاکستان کا ایک صحت افزا مقام اور سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہے۔ جس مقام پر اس خاتون کو دفن کیا گیا وہ پنڈی پوائنٹ کے نام سے موسوم ہے اور قبر کا نام "مائی مریم دا استھان" ہے جس کا مفہوم ہے "اماں مریم کی آرام گاہ" اب تو بعض مغربی مورخ بھی اس قبر کو مریم کی قبر قرار دیتے ہیں کیونکہ بعض روایات بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔

اس قبر کے بارے میں ایک ٹھوس ثبوت یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ قبر کا رخ شرقاً"

غربا" ہے۔ یعنی ابتدا میں یہ شرقا" غربا" بنائی گئی ہو گی اور بعد میں اس پر مٹی ڈالنے والوں اور اس کی مرمت کرنے والوں نے بھی اس کے پہلے رخ پر ہی قائم رکھا۔ شرقا" غربا" وہ رخ ہے جس پر بنو اسرائیل اپنی میتیں دفن کرتے تھے جبکہ مسلمانوں کی قبروں کا رخ شمالا" جنوبا" ہوتا ہے اس سلسلے میں ایک ممتاز ہسپانوی مورخ نے دیگر محققین کی ریسرچ سے استفادہ کرتے ہوئے بعض بہت ہی معنی خیز حقائق بیان کئے ہیں جن کا انکار ممکن نہیں وہ لکھتے ہیں :۔

جس زمانے میں مریم کی وفات ہوئی' ان دنوں راولپنڈی اور اس کے گردو نواح پر ہندو حکمران تھے یہ لوگ دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے اور توہم پرست تھے جب انہوں نے پہاڑی کی چوٹی پر ایک تازہ قبر دیکھی تو اس کا احترام کرنے لگے رفتہ رفتہ نذریں چڑھائی جانے لگیں اور مرادیں مانگی جانے لگیں اس طرح اسے ایک زیارت گاہ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ جب اس علاقے کو مسلمانوں نے فتح کیا تو انہوں نے دیکھا کہ اس قبر کا ہندو احترام کرتے ہیں ساتھ ہی انہوں نے سوچا ہو گا کہ اگرچہ ہندو اس قبر کا احترام کرتے ہیں لیکن یہ قبر کسی یہودی یا عیسائی بزرگ کی ہو سکتی ہے کیونکہ ہندو تو قبر نہیں بناتے وہ تو اپنے مردوں کو جلا دیتے ہیں چنانچہ مسلمانوں نے بھی اس قبر کا احترام کرنا شروع کر دیا جب انگریزوں نے برصغیر پاک و ہند پر قبضہ کیا تو ۱۸۹۸ء میں انہوں نے اس قبر کے نزدیک ایک دفاعی چوکی قائم کر دی مگر اس علاقے کے لوگ بدستور قبر کی زیارت کے لئے آیا کرتے تھے ۱۹۱۷ء / ۱۹۱۶ء کا واقعہ ہے کہ یہاں متعین فوجی رجمنٹ کے ایک انجینئر کیپٹن رچرڈسن نے اس قبر کو منہدم کرانا چاہا تاکہ لوگ اس دفاعی چوکی کے قریب نہ آئیں لیکن علاقے کے لوگوں نے اس پر سخت احتجاج کیا یہاں تک کہ میونسپل کمیٹی کو اس معاملے میں مداخلت کرنا پڑی آخر اس سارے معاملے کی تحقیقات کی گئی۔ اس تحقیقات کی ایک فائل تیار ہوئی اس فائل کا نمبر ۱۱۸ ہے اور اس پر تاریخ ۳۰ جولائی ۱۹۱۷ء کی درج ہے (یہ فائل مری میونسپل کمیٹی کے ریکارڈ میں ۱۹۷۰ء تک موجود تھی) اس فائل میں مقامی باشندوں کے جو بیانات ریکارڈ کئے گئے ہیں ان کی رو سے پنڈی پوائنٹ پر

واقع اس قبر میں ایک ایسی شخصیت دفن ہے جس میں اولیائی صفات پائی جاتی ہیں' ہندو اور مسلمان دونوں اس کا ایک جیسا احترام کرتے ہیں۔ خشک سالی میں اس قبر پر دعا کرنے سے بارش ہو جاتی ہے۔ اس صداقت کی اس (انگریز) افسر نے بھی تصدیق کی جو اس ساری تحقیقاتی کارروائی کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے خود شہادت دی کہ ۱۹۱۷ء میں سخت خشک سالی تھی اس قبر کے اردگرد کھڑے ہو کر دعا کی گئی جس کے بعد بارش ہوئی اور تین دن تک ہوتی رہی برف باری بھی ہوئی آخر فیصلہ کیا گیا کہ قبر کو منہدم نہ کیا جائے۔ اور پھر منہدم نہیں کیا گیا (11)

گویا مریم نامی ایک بزرگ خاتون کا مزار جو حضرت مسیحؑ کے ساتھ سفر کر رہی تھیں راولپنڈی کے قریب مری نامی مقام پر واقع ہے۔ یہاں بجا طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت مریمؑ مری میں دفن ہیں تو کاشغر میں ان کا مزار کیسے بن گیا؟

تین مریم

اس سوال کا جواب تلاش کرنا زیادہ مشکل نہیں۔ تاریخ سے مریم نامی تین خواتین کی حضرت مسیحؑ سے وابستگی ثابت ہوتی ہے ایک مریم جو حضرت مسیحؑ کی والدہ تھیں دوسری مریم مگدلینی اور تیسری مریم جو رشتے میں حضرت مسیحؑ کی بہن تھیں چنانچہ جب حضرت مسیحؑ کو صلیب سے اتار کر ان کی عارضی قبر میں رکھا گیا تو تیسرے روز ان میں سے مریم نام کی دو خواتین ان کی قبر پر آئی تھیں۔ انجیل میں ہے کہ :۔

"اور سبت کے بعد ہفتے کے پہلے دن پو پھٹتے وقت مریم مگدلینی اور دوسری مریم قبر کو دیکھنے آئیں ○ (12)

یہ دوسری مریم ظاہر ہے کہ حضرت مسیحؑ کی والدہ نہیں ہو سکتی تھیں کیونکہ انہیں تو حضرت مسیحؑ نے واقعہ صلیب کے وقت یوحنا حواری کے سپرد کر دیا تھا اور یوحنا انہیں لے کر یروشلم سے چلے گئے تھے بفرض محال اگر وہ مریم حضرت مسیحؑ کی والدہ ہی ہوتیں تو انجیل میں ان کے نام کے ساتھ اس کی وضاحت موجود ہوتی تاکہ قاری کا ذہن کسی اور مریم کی طرف منتقل نہ ہو جائے اور پڑھنے والا سمجھ لے کہ یہ دوسری مریم حضرت مسیحؑ کی

والدۂ ماجدہ تھیں مگر وہاں "ایک اور مریم" یا "دوسری مریم" کے الفاظ درج ہیں جس سے حضرت مسیحؑ کی والدہ کی بجائے مریم نامی کوئی اور خاتون مراد ہیں پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کی عارضی قبر پر مریم نام کی دو خواتین آئی تھیں ایک مریم مگدلینی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان سے حضرت مسیحؑ کی شادی ہونی تھی یا بعد میں ہو گئی تھی اور دوسری مریم جو رشتہ میں حضرت مسیحؑ کی بہن تھیں۔

تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ واقعہ صلیب کے بعد جب حضرت مسیحؑ اپنے طویل سفر پر روانہ ہوئے تو عراق میں داخل ہونے کے بعد چند عقیدت مندوں کے علاوہ مریم نام کی دو اور خواتین بھی آپؑ کی شریک سفر ہو گئیں جو آخر تک آپؑ کے ساتھ رہیں۔ (13)

ان دو خواتین میں سے ایک حضرت مسیحؑ کی والدہ اور دوسری مریم مگدلینی تھیں اس دوسری مریم کے بارے میں مورخین اور جناب مسیحؑ کے ایک حواری نے صراحت کی ہے کہ یہ مریم وہ تھیں جنہوں نے جناب مسیحؑ کے ہاتھ پر توبہ کی تھی یعنی بپتسمہ لیا تھا (بیعت کی تھی)

ظاہر ہے کہ حضرت مسیحؑ کے ہاتھ پر توبہ کرنے کی ضرورت ان کی والدہ کو نہیں ہو سکتی تھی توبہ کی ضرورت ان یہودی مردوں اور عورتوں کو تھی جو ابھی تک جناب مسیحؑ پر ایمان نہیں لائے تھے چنانچہ یہ دوسری مریم یقیناً آپؑ کی والدہ کے علاوہ تھیں اور یہ وہی مریم مگدلینی ہو سکتی تھیں جو آپؑ کے ساتھ سفر پر روانہ ہوئی تھیں اور جن سے آپؑ کی نسبت ٹھہر چکی تھی۔

بلا شبہ یہ دوسری مریم بھی انتہائی محترم اور خدا اور اس کے نبی کی محبت میں سرشار تھیں جنہوں نے اللہ کی راہ میں سخت تکالیف برداشت کیں حتیٰ کہ اس راہ میں جان تک قربان کر دی۔ پس حضرت مسیحؑ کے اس سفر میں مریم نام کی جن دو عورتوں کا ذکر آتا ہے ان میں سے ایک مریم کا مزار کاشغر میں ہے اور دوسری کا مری کی پہاڑیوں میں۔ کاشغر میں جن مریم کا مزار ہے ہمارے خیال کے مطابق وہ حضرت مسیحؑ کی والدہ تھیں اور مری میں جن مریم کا مزار ہے وہ حضرت مسیحؑ کی منگیتر مریم مگدلینی تھیں۔

حوالہ جات

(1) یوحنا باب نمبر19 آیت نمبر25 تا 27

(2) Early Sites Of Christianity PP - 109-110

(3) Acts Of Philip Translated By Mr. James In The Apocryphal New Testament P-442

(4) Conontex Of The New Testament By C.R. Gregory P-511

(5) بحار الانوار جلد نمبر5 صفحہ 325 اور جلد نمبر13 صفحہ نمبر155

(6) تفسیر ابن جریر جلد نمبر3 صفحہ نمبر197

(7) روضۃ الصفا جلد نمبر1 صفحہ نمبر124

(8) China And The Cross By Calumba Cary-Flwes PP-3, 10-11.

(9) The Heart Of Asia P-39

(10) Gospel Of Philip, Hasper & Row (And) The Nazarene Gospel Restored P-777

(11) Jesus Died In Kashmir, By A.Faber Kaser P-82, 83

(12) متی باب نمبر28 آیت نمبر1

(13) The Nazarene Gospel Restored. P-777

رفعِ مسیحؑ کی سائنسی بنیاد

(اس باب کے مخاطب صرف اہلِ مغرب اور مغرب زدہ لوگ ہیں)

سائنس کہتی ہے کہ اگر حضرت مسیحؑ کسی مشینی ذریعے کے بغیر آسمان پر جاتے تو راستے میں ان کا جسم غیر مادی ایٹمی توانائی میں تبدیل ہو جاتا اور پھر اتنا بڑا ایٹمی دھماکہ ہوتا کہ نہ صرف یروشلم بلکہ سارا فلسطین تباہ و برباد ہو جاتا اسی لئے یورپ کے کٹر مسیحی رہنما لاجواب ہو کر یہ راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ جناب مسیحؑ کے آسمان پر اٹھائے جانے والے واقعے کو صرف مذہبی عقیدے تک محدود رکھا جائے اس کی سائنسی توجیہ سے گریز کیا جائے۔

مغرب کے وہ لوگ جنہیں موجودہ سائنسی علوم کا بانی قرار دیا جاتا ہے اور جن کی فکر و نظر کا ہر گوشہ علوم جدیدہ سے روشن ہے ان سے ہمارا سوال ہے کہ سائنسی علوم سے بہرہ ور ہونے کے باوجود کیا ان کی عقل تسلیم کرتی ہے کہ ایک شخص کسی مشینی اور مادی ذریعہ اور وسیلے کے بغیر جسمانی طور پر آسمان کی طرف پرواز کر جائے اور دو ہزار سال سے وہاں بیٹھا ہو؟ ہمارا مشاہدہ بھی یہی بتاتا ہے کہ یہ تو ممکن ہے اور ہم آئے دن دیکھتے بھی ہیں کہ ایک شخص کسی غبارے کے ذریعے چند سو فٹ کی بلندی تک چلا جائے، ہوائی جہاز کے ذریعے چند ہزار فٹ کی بلندی تک بھی پہنچا جا سکتا ہے اور خلائی راکٹ کے ذریعے خلا میں اور اس سے آگے گزر کر کسی سیارے تک بھی انسان کی رسائی ممکن ہے لیکن یہ رسائی ذرائع اور وسائل کے بغیر ہرگز ممکن نہیں جبکہ حضرت مسیحؑ کسی غبارے، جہاز،

خلائی راکٹ یا کسی مشینی ذریعے کے بغیر آسمان کی جانب پرواز کر گئے۔ کیا اہل یورپ عقلی اعتبار سے اس کمزور ترین اور غیر سائنسی واقعے پر اظہار تعجب نہیں کرتے اور اسے خلاف واقعہ اور خلاف عقل نہیں سمجھتے؟

آسمان پر زندگی؟

خداوند تعالیٰ کا قانون قدرت بھی یہی ہے کہ دنیا کا کوئی کام وسائل اور وسائط کے بغیر سرانجام نہیں پا سکتا۔ وہ اس بات پر قادر ہے کہ انسان کو روشنی کے بغیر دیکھنے کی طاقت عطا فرما دے، ہوا کے بغیر سننے کی صلاحیت بخش دے اور زبان کے بغیر کلام کرنے کی طاقت سے نواز دے مگر وہ ایسا نہیں کرتا۔ اس نے دیکھنے کے لئے روشنی سننے کے لئے ہوا اور کلام کرنے کے لئے زبان کو وسیلہ بنایا اس کا یہ قانون ازلی و ابدی ہے اور اس فانی دنیا کا ایک ذرہ بھی وسائل کے بغیر اپنا وظیفہ حیات سرانجام نہیں دے سکتا۔ پس قانون قدرت، عقل، سائنس اور مشاہدہ کسی بھی ایسے واقعے کے رونما ہونے کا انکار کرتے ہیں جس میں ظاہری وسائل اور ذرائع کو دخل نہ ہو اس لئے حضرت مسیحؑ کا کسی وسیلے اور ذریعے کے بغیر آسمان پر جانا اللہ تعالیٰ کے قانون کے خلاف اور عقلی اعتبار سے بھی ناممکن ہے۔ اس موضوع پر غور و فکر کرتے وقت یہ بھی سوچنا ہو گا کہ آخر آسمان ہے کیا؟ جہاں حضرت مسیحؑ قیام فرما ہیں۔ آسمان اپنی ذات میں کوئی ٹھوس چیز نہیں جس پر کوئی شخص جا بیٹھے۔ آسمان نیلے رنگ کے اس منظر کا نام ہے جہاں جا کر ہماری نظر ٹھہر جاتی ہے اور اس سے آگے ہم نہیں دیکھ سکتے۔ اس حد اور نظر تک جو کچھ ہے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک خلا' دوسرا اجرام فلکی یعنی سورج چاند ستارے سیارے وغیرہ۔ یہ اجرام فلکی بھی اسی خلا' میں تیر رہے ہیں۔ ان ہی دونوں چیزوں یعنی خلا' اور اجرام فلکی کے مجموعے کا نام آسمان ہے۔ جہاں تک خلا کا تعلق ہے وہاں حضرت مسیحؑ کا قیام ناممکن اور خلاف عقل ہے کیونکہ خلاء میں کسی کیپسول، کسی راکٹ یا خلائی جہاز کے بغیر انسان رہ سکتا ہی نہیں ورنہ اسے بے وزنی کی کیفیت سے دوچار ہونا پڑے گا اس کا جسم خلاء میں تیرتا پھرے گا اور بھوک پیاس کی اذیت برداشت کرتے کرتے آخر کار موت کا شکار ہو جائے گا۔ زمین سے جتنے لوگ خلا میں یا چاند پر گئے اپنے جسم و جاں کی حفاظت کا تمام

سامان اور کھانے پینے کی اشیاء ساتھ لے کر گئے کیونکہ اس کے بغیر خلاء میں یا کسی سیارے پر زندگی گذارنا ممکن ہی نہیں جبکہ حضرت مسیحؑ اپنے ساتھ کوئی چیز لے کر نہیں گئے۔ سوال یہ ہے کہ وہ خلاء میں کھائے پیئے بغیر کیسے زندہ ہیں؟

آسمان پر قیام کرنے کی دوسری جگہ ستارے یا سیارے ہیں ان میں زندگی گذارنا بھی ممکن نہیں کیونکہ زمین پر پیدا ہونے والا انسان زمینی ماحول میں پروان چڑھا ہے۔ وہ اسی ماحول میں زندہ رہ سکتا ہے جس ماحول میں اس کا ہیولیٰ تیار ہوا ہے اس سے مختلف ماحول میں زندہ رہنا اس کے لئے ممکن ہی نہیں۔ زندگی گذارنے کے لئے مٹی ہوا پانی آگ اور خوراک کی ضرورت ہے اور یہ چیزیں ایسی مخلوق کے وجود کا تقاضا کرتی ہیں جو ان عناصر اربعہ کی مدد سے اپنی خوراک تیار کر سکے۔

اگر ایسی مخلوق کسی سیارے میں مل بھی جائے تو اس کی شکل و صورت اور جسمانی ساخت کی نوعیت کیا ہوگی کیا وہ انسان کو دیکھ کر خوف زدہ نہیں ہو جائے گی اور اپنی جان بچانے کے لئے کسی محفوظ جگہ پر پناہ لینے کے لئے بھاگ نہیں جائے گی؟ یا دوسری صورت میں وہ زمینی انسان پر حملہ کر کے اس کا کام تمام نہیں کر دے گی؟ اس کی زبان تہذیب اور احساسات کس قسم کے ہوں گے؟ انسان اس مخلوق سے کس طرح مفاہمت کرے گا اور اس کے ساتھ زندگی گذارنے پر خود کو کیونکر آمادہ و تیار کرے گا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ محض قیاسات اور مفروضوں سے کام لینا پڑے گا اور ایک فرضی دنیا گھڑنی پڑے گی جہاں حضرت مسیحؑ کو اتارنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ سائنس اس قسم کی کہانیوں اور دیومالائی داستانوں کو تسلیم نہیں کرتی۔

شہاب ثاقب کے حملے

اگر تھوڑی دیر کے لئے فرض بھی کر لیا جائے کہ حضرت مسیحؑ کسی راکٹ یا خلائی جہاز کے بغیر آسمان کی طرف پرواز کر گئے تو بھی کچھ وقت کے بعد ان کا مادی جسم اپنی اصل صورت میں برقرار نہیں رہ سکا ہوگا کیونکہ سائنس کی رو سے آسمان کی طرف جاتے ہوئے ایک ایسا مقام آتا ہے جہاں ہوا ختم ہو جاتی ہے اس مقام سے نکلتے ہی انسانی جسم اپنے اندرونی دباؤ سے پھٹ جائے گا اس نئے ماحول (خلا) میں وہ سانس بھی نہیں لے سکے

گا کیونکہ ہوا موجود نہیں ہوگی اس لئے دم گھٹ کر ہلاک ہو جائے گا پھر راستے میں شہاب ثاقب (Meteors) کی بوچھاڑ کا بھی شکار ہو سکتا ہے یا سورج کی بالائی بنفشی شعاعوں (Ultra Violet Radiation) کے اثرات سے تھوڑے ہی عرصہ میں موت کے منہ میں چلا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ زمین سے خلا کی طرف جانے والے لوگ خلائی لباس کے بغیر سفر نہیں کرتے اور کیپسول' راکٹ یا خلائی جہاز میں ہونے کے باوجود خلائی لباس پہننا ان کے لئے ضروری ہوتا ہے ورنہ ان کی زندگی خطرے میں پڑ جائے اور وہ ہلاکت کے منہ میں جا پڑیں۔

"اوزون" گیس کی تہ

جدید سائنس نے حال ہی میں ایک اور انکشاف کیا ہے۔ اس انکشاف نے حضرت مسیحؑ کے آسمان پر جانے کے نظریئے کو بالکل ہی باطل کر دیا ہے۔ اس سائنسی تحقیق کی رو سے زمین کے ارد گرد گیس کی ایک تہہ موجود ہے جسے اوزون (Ozone) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ گیس سورج سے خارج ہونے والی ناقابل برداشت گرمی کو زمین پر آنے سے روکتی ہے۔ اگر گیس کی یہ تہہ موجود نہ ہو تو ہمارا کرۂ ارض آگ کا گولہ یا آتشیں سیارہ بن جائے جس پر کسی قسم کی نباتاتی' حیوانی یا انسانی زندگی کا وجود تو کیا اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سائنس دانوں نے انکشاف کیا ہے کہ گیس کی اس تہہ میں سوراخ پیدا ہو رہے ہیں۔ وہ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ زمین پر موجود کارخانوں اور تیل سے چلنے والی گاڑیوں سے جو دھواں خارج ہوتا ہے اس میں کثیر مقدار میں کاربن ڈائی آکسائیڈ موجود ہوتی ہے یہ کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کی اس تہہ کو نقصان پہنچا رہی ہے جو زمین کو سورج کی گرمی کی شدت سے محفوظ رکھتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ زمین کے درجہ حرارت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس صورتحال کی وجہ سے سائنس دان بہت سخت مضطرب اور فکر مند ہیں وہ کہہ رہے ہیں کہ اگر یہ صورت حال اسی طرح قائم رہی تو گرمی کی شدت کی وجہ سے زمین کے دونوں سروں پر قطبین کی برف پگھلنی شروع ہو جائے گی اور پانی کا وہ طوفانی سیلاب آ جائے گا جس کی وجہ سے سطح سمندر بلند ہو جائے گی اور بہت سے ایسے ملک غرق آب ہو جائیں گے جو سطح سمندر سے نشیب میں واقع ہیں جیسے ہالینڈ

اور بلجیم وغیرہ' اس لئے سائنس دان بار بار دنیا کی حکومتوں کو متنبہ کر رہے ہیں کہ وہ اس آلودگی کا سدباب کریں۔

اس پس منظر میں سوچئے کہ زمین سے ایک خاص بلندی پر اتنی شدید گرمی ہے کہ اسے زمین تک پہنچنے سے روکنے کے لئے قدرت نے اوزون (Ozone) نامی گیس کی تہہ بچھادی ہے اگر یہ تہہ معدوم ہو جائے تو یہ سارا کرۂ ارض آگ کا گولہ بن جائے گا۔ اس گیس کی تہہ کو پار کر کے اگر کوئی شخص آگے کی طرف جانے کی کوشش کرے گا تو جل کر خاک سیاہ ہو جائے گا ماسوائے اس کے کہ اس نے خود کو کیپسول راکٹ یا خلائی جہاز میں محفوظ کر لیا ہو۔ پس گیس کی اس تہہ کو پار کر کے حضرت مسیحؑ کا آسمان پر جانا غیر ممکن' خلاف عقل اور غیر سائنسی ہے۔ یہ ایسا نظریہ ہے جس کو سن کر ہنسی آتی ہے۔

بعض لوگ یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر امر پر قادر ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے بلاشبہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اور اس کی قدرتوں کی کوئی انتہا نہیں' وہ جو چاہے کر سکتا ہے مگر اسی قادر مطلق نے اپنی قدرت کی کچھ حدود مقرر فرمادی ہیں اور اعلان فرما دیا ہے کہ "تم اللہ کی سنت (قانون) میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔" (القرآن)

یعنی وہ کوئی کام اپنی سنت اور قانون کے خلاف نہیں کرتا یہ خود خداوند تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق کی بجائے مغرب کی طرف سے طلوع فرما سکتا ہے وہ اس پر پوری طرح قادر ہے مگر اس نے آج تک ایسا نہیں کیا کیونکہ یہ امر خود اس کے مقرر کردہ قانون کے خلاف ہے۔ وہ اس امر پر قادر ہے کہ مچھر کو ہاتھی بنا کر زمین پر پہاڑ کی طرح کھڑا کر دے اور ہاتھی کو مچھر بنا کر ہوا میں اڑانے لگے مگر اس نے آج تک ایسا نہیں کیا کیونکہ یہ اس کے قانون قدرت کے خلاف ہے اس نے اس کائنات اور موت و حیات کے کچھ قوانین بنا دیئے ہیں جو اٹل ہیں ان کے خلاف کوئی کام کرنا اللہ تعالیٰ اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔

یہاں بھی بعض کٹر قسم کے مذہبی لوگ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت مسیحؑ کے لئے اپنے قانون قدرت میں تبدیلی کر سکتا تھا تاکہ ان کے جسم پر خلاء میں ظاہر ہونے والے اثرات نہ پڑتے اور وہ ہر گزند سے محفوظ رہتے لیکن ایسے لوگ بھول جاتے ہیں کہ

اگر اللہ تعالیٰ اس قسم کی قدرت دکھاتا تو اس کا مظاہرہ اس وقت بھی کر سکتا تھا جب حضرت مسیحؑ کو یہودیوں نے گرفتار کروایا اور انہیں ایذائیں دی گئیں۔ آپؑ کو کوڑے مارے گئے صلیب پر کھینچا گیا۔ عام قانون قدرت کے مطابق حضرت مسیحؑ کے جسم پر ان ضربات اور صدمات کا پورا پورا اثر ظاہر ہوا کوڑوں کی ضرب سے ان کی کھال اڑ گئی' خون بہہ نکلا درد کی شدت سے آپؑ چلائے بقول انجیل کے چیخ ماری۔ آپؑ کے جسم نے خارجی تکالیف کا پورا اثر قبول کیا حتیٰ کہ شدت درد سے بے ہوش ہو گئے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیحؑ کے لئے اس وقت بھی اپنے عام قانون میں تبدیلی نہیں کی پھر یہ کیسے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ جب حضرت مسیحؑ زمین سے آسمان کی طرف روانہ ہوئے تو خداوند تعالیٰ نے اپنا قانون بدل ڈالا اور ان کے لئے شہاب ثاقب کی بوچھاڑ کو بھی روک دیا' سورج کی بنفشی شعاعوں کے اثرات کا عمل بھی معطل کر دیا اور ہوا نہ ہونے کی وجہ سے انہیں سانس گھٹنے کے خطرے سے بھی محفوظ رکھا۔ اگر اللہ تعالیٰ اس سے قبل حضرت مسیحؑ کے ساتھ اس غیر معمولی طرز عمل کا مظاہرہ کر چکا ہوتا تو اس دوسرے موقع پر یہ فرض کیا جا سکتا تھا کہ اس نے حضرت مسیحؑ کے لئے اپنے قانون قدرت میں تبدیلی کر دی مگر واقعات شہادت دیتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کے واقعہ صلیب کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اپنے عام قانون میں کوئی تبدیلی نہیں کی' ان پر ماحول اور حادثات نے پورا اثر ڈالا اور وہ زخمی بھی ہوئے' خون بھی بہا' شدت درد سے غشی بھی طاری ہوئی فریاد بھی کی اور درد سے بے قابو ہو کر چیخ بھی ماری۔ اور تو اور خود رسول اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے اپنا قانون تبدیل نہیں کیا چنانچہ جنگ احد کے موقع پر حضور اقدسؐ زخمی بھی ہوئے' زخموں سے خون بھی بہا' حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ نے مل کر آپؐ کی مرہم پٹی کی۔ پس حضرت مسیحؑ کے آسمان پر جانے کے تصور پر جتنا بھی غور کیا جائے یہ سرا سر فرضی' افسانوی اور غیر سائنسی نظریہ ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں۔

ایٹمی سائنس کا نقطہ نظر

یورپ کے مسیحی رہنما جو ان معاملات کو خالص مذہبی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں ان منطقی دلائل سے لاجواب ہو کر اب یہ راستہ اختیار کرنے لگے ہیں کہ "جناب مسیحؑ کے

آسمان پر اٹھائے جانے والے واقعے کو صرف مذہبی عقیدے تک محدود رکھا جائے اور اس کی سائنسی توجیہات سے گریز کیا جائے" کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ ان کا یہ عقیدہ ایٹمی سائنس دانوں کی سائنسی تحقیقات کے بھی خلاف ہے۔ جدید سائنسی تحقیقات کی رو سے ایسا جسم جس میں خون اور گوشت موجود ہو اور یہ خون رواں دواں بھی ہو کسی مشینی ذریعے کے بغیر ہوا میں بلند نہیں ہو سکتا سوائے اس کے کہ انسانی جسم غیرمادی توانائی میں تبدیل ہو جائے لیکن اس اچانک عمل سے جو صورت حال پیدا ہو گی اس کا ادراک نہیں کیا گیا وہ تو بہت ہی خوفناک ہو گی۔ چنانچہ مغرب کے دو فاضل مصنفوں نے اس عقیدے کا سائنسی تجزیہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:۔

"جناب مسیحؑ جن کا جسم انسانی گوشت اور خون سے بنا تھا اگر آسمان کی طرف گئے تھے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کا مادی جسم غیرمادی ایٹمی توانائی میں تبدیل ہو گیا تھا کیونکہ اس کے بغیر انسانی جسم کا آسمان پر جانا ممکن ہی نہیں۔ اگر ایسا واقعہ پیش آتا یعنی ایک انسانی مادی جسم غیرمادی ایٹمی توانائی میں تبدیل ہوتا تو اس اچانک عمل کے نتیجے میں اتنی ایٹمی توانائی خارج ہوتی کہ وہ یروشلم بلکہ تمام فلسطین کو تباہ و برباد کر دیتی مگر تباہی کا کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا اس سے ثابت ہوا کہ حضرت مسیحؑ آسمان کی طرف نہیں گئے۔"

اس سائنسی تجزیے کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

It would have been impossible for Jesus,s body, if of human flesh and blood, to rise in the air without mechanical aid; and its sudden dematerialization would have released sufficient energy to wreck jerusalem and all palestine __ a catastrophe which did not, in fact, take place.

"Jesus in rome," by ROBERT GRAVES and JOSHUA PODRO___P-5

گویا تاریخ اور مذہب کے علاوہ سائنس نے بھی حضرت مسیحؑ کے آسمان پر جانے کے عقیدے کو غیر معقول اور ناقابل قبول قرار دے دیا۔

اللہ بس، باقی ہوس

ooo